اسلامی فلسفۂ جنگ کی تحقیق

معاصر جہادی تصورات کا جائزہ اور چند اہم شبہات کا ازالہ

تفہیم جہاد

۱۴۴۴ھ

امن اسلامی کا الٰہی منشور

ذیشان احمد مصباحی

تفهیم جہاد

ذیشان احمد مصباحی

Tafhim-e-Jihad

Zishan Ahmad Misbahi

صفحات : ۲۰۰/صفحات

قیمت : ۲۲۵/روپئے

سن اشاعت : ۲۰۲۴ء

مطبع : تنوی پرنٹرس، دہلی

زیر اہتمام : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

ناشر : خسرو فاؤنڈیشن، ڈی۔319، ڈیفنس کالونی، نئی دہلی۔110024

مرشد عصر

شیخ ابوسعید محمدی صفوی (۱)

کے نام

جن کی صحبت فیض نے "تفہیم جہاد" کی راہیں کھولیں!

(۱) سجادہ نشین: خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں، کوشامبی، یوپی

شذرات

اسلام کا فلسفۂ دین انتہائی واضح اور سہل ہے۔اس لیے اس کی دعوت میں اصلاً جبر و اِکراہ اور قوت و جنگ کی سرے سے حاجت ہی نہیں ہے!

ایمان و کفر کے معاملے میں اسلام نے انسان کو صاحب اختیار رکھا ہے اور اُسے اس کے لیے تدبر و تفکر کو استعمال کرنے کی دعوت دی ہے!

قرآن کے واضح نصوص دین کے معاملے میں کسی بھی طرح کے جبر و اِکراہ کے خلاف ہیں!

داعی سے صرف یہ سوال ہونا ہے کہ اس نے اپنی ذمہ داری پوری کی یا نہیں، اس لیے اُسے جبر و اِکراہ کی سرے سے حاجت ہی نہیں ہے!

قرآن اکراہ اور مجبوری میں قبول کیے گئے اسلام کو سرے سے اسلام ہی تسلیم نہیں کرتا، ایسے میں اسلامی دعوت میں جبر و اِکراہ کا تصور ہی عبث اور فضول ہے۔(۱)

-----

(۱) سابق شیخ الازہر شیخ محمد شلتوت، القرآن والقتال، ص: ۳۳، ۳۴، ملخصاً، قاہرہ، ۲۰۱۷ء

مشمولات

پیش لفظ ۷
حرف آغاز ۱۰
مفہوم جہاد ۱۴
اقسام جہاد ۲۰
غلط فہمی کے اسباب ۲۷
اسلام-ایک پرامن دعوتی مذہب ۳۳
تلاش امن-دعوت سے جہاد تک ۴۰
وجہِ جنگ-ظلم وفساد کا خاتمہ ۴۸
اسلامی فلسفۂ جنگ پر چند سوالات ۵۵
پہلا سوال-کیا اسلام کفر کے خلاف جنگ چاہتا ہے؟ ۵۶
دوسرا سوال-کیا اسلام شوکت کفر کے خلاف جنگ چاہتا ہے؟ ۶۴
تیسرا سوال-فتنہ اور ازالۂ فتنہ کی حقیقت کیا ہے؟ ۶۷
چوتھا سوال-کیا آیت سیف، آیات امن کے لیے ناسخ ہے؟ ۷۷
پانچواں سوال-اللہ کے لیے کل دین ہونے کے کیا معنی ہیں؟ ۸۵
چھٹا سوال-کیا جہاد مشرکین عرب پر آسمانی عذاب تھا؟ ۹۳
ایک وضاحت-گذشتہ اقوام پر خدائی عذاب کیوں نازل ہوا؟ ۱۰۰
ساتواں سوال-کیا مشرکین عرب کے لیے دو ہی راستے تھے، اسلام یا تلوار؟ ۱۰۵

آٹھواں سوال ۔کیا تمام مشرکین کے خلاف جنگ ضروری ہے؟	۱۱۴
نواں سوال ۔کیا لوگوں کو مسلمان بنانے کے لیے جنگ جائز ہے؟	۱۱۸
دسواں سوال ۔صحابہ نے دیگر اقوام سے جنگ کیوں کی؟	۱۲۵
گیارہواں سوال ۔کیا مصالحت صرف بصورت مجبوری جائز ہے؟	۱۳۳
اصل الاصول	۱۳۹
شرائط وآداب	۱۴۳
حرف اختتام	۱۵۷
پس نوشت	۱۶۱

ضمیمہ

شدت پسند تنظیموں کی فکری بنیادیں	مولانا محمد ضیاء الرحمٰن علیمی	۱۷۰

کتابیات	۱۹۱
خسرو فاؤنڈیشن ۔ایک نئی پہل	۱۹۶
تعارف مصنف	۱۹۹

پیش لفظ

زیرنظر کتاب ''تفہیم جہاد'' خسرو فاؤنڈیشن کی ایک شاہکار پیش کش ہے۔اس کے مصنف مولانا ڈاکٹر ذیشان احمد مصباحی نے اپنی اس معروضی تحقیق میں انتہائی باریک بینی اور فراست علمی کے ساتھ عہد حاضر کے ایک انتہائی حساس موضوع پر قرآن وحدیث، فقہ و تفسیر اور عقلی وعصری مطالبات کی روشنی میں گفتگو کی ہے اور فلسفۂ جہاد کی صحیح تعبیر وتوضیح اور موضوع سے متعلق قابل قدر مواد پیش کرنے کے ساتھ جہاد کی غلط تعبیرات کی تردید اور اس حوالے سے قائم عام غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس تاریخی علمی کام کے لیے وہ ہم سب کی طرف سے قابل مبارک باد ہیں۔

''مسئلۂ جہاد'' عصر حاضر میں سب سے زیادہ زیر بحث رہنے والے موضوعات میں سے ایک ہے۔اسے مختلف ادوار میں مختلف تنظیموں، ایجینسیوں اور علمانے اپنے اپنے نظریات اور مفادات کے فروغ کے لیے استعمال کیا ہے۔اس کی غلط تعبیر وتشریح سے ملتِ اسلامیہ کو جو نقصانات ہوئے ہیں وہ ناقابل تلافی ہیں۔جہاد جیسے پاکیزہ لفظ کا استعمال بعض نام نہاد اسلامی تنظیموں نے دنیا میں قتل وغارت گری اور دہشت ووحشت پھیلانے کے لیے بھی کیا ہے جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔اس پر میڈیا کی زہر افشانیوں نے آگ میں گھی ڈالنے کا کام کیا، جس کے نتیجے میں آج یہ لفظ ہی negative ، بلکہ taboo بن چکا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واضح فرمان موجود ہے کہ میری حیات کے بعد صرف تیس سال تک ہی مثالی اسلامی حکومت رہے گی اور پھر ملوکیت یعنی monarchy آجائے گی۔ چنانچہ امام حسن کی دستبرداری کے بعد ہی خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی جس کی بدترین تصویر

معرکۂ کربلا میں امام حسین کی شہادت ہے، جو اسلامی تاریخ میں واقع ہونے والی ایک کھلی ہوئی دہشت گردی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے بعد بھی بہت سے اچھے مسلم حکمراں سامنے آئے جنھوں نے زمین پر مثالی اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ گزرتے ایام کے ساتھ شریعت میں طبیعت شامل کرنے کا دور شروع ہوا جس کے سبب وقت کے بہت سارے مسلم حکمرانوں نے جو خلیفہ یا بادشاہ کہلاتے تھے، اپنے غیر شرعی اور جارحانہ طرز عمل کو بھی اسلامی شریعت کے قالب میں ڈھال کر پیش کرنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے خارجی اور تکفیری فکر نے اپنے قدم جمانے میں کامیابی حاصل کی۔

الغرض! اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کئی بار ایسے اتار چڑھاؤ سامنے آئے جہاں مسلمان اقتدار اور دولت کے حصول میں سرگرداں آپس میں ہی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہے اور حصول ثروت وطاقت اور حکمرانی کے لیے کی جانے والی اپنی خون ریزیوں کو بھی خود ساختہ جہاد سے تعبیر کرتے رہے، جب کہ قرآن کے نظریۂ جہاد اور پیغمبر اسلام کے آفاقی فلسفۂ جنگ سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اموی دورِ حکومت ہو یا خلافت عباسیہ، سلطنت عثمانیہ ہو یا مغلیہ دور حکومت، ان سب کا مقصود بالعموم اسلام کے فلسفۂ جہاد پر منحصر نہیں بلکہ اپنی اپنی حکومتوں اور علاقوں کی توسیع تھی۔

سلطنت عثمانیہ کے سقوط اور برٹش امپائر کے عروج کے ساتھ جب colonial system نے دنیا کے بیشتر حصے کو اپنے قبضے میں لے لیا اور عوام الناس کے ساتھ غلاموں سے بدتر سلوک کیا تب اسلام کے نام پر کچھ ایسی تنظیمیں اور تحریکیں وجود میں آئیں جنھوں نے اسلام وقرآن کی مَن مانی تشریحات کرنا شروع کیا اور مقامی مسلمانوں کی مظلومی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں جہاد کے نام پر اکسانے کا کام کیا۔ مصر میں پیدا ہونے والی تحریک اخوان المسلمین کے سید قطب اور برصغیر میں وجود میں آنے والی جماعت اسلامی کے مولانا ابوالاعلی مودودی نے اپنی مشہور زمانہ کتابوں ''معالم فی الطریق'' (Milestones) اور ''الجہاد فی الاسلام'' کے ذریعے جہاد کی نئی تعبیر وتشریح پیش کی جس کی وجہ سے جہاد کا نیا perception سامنے آیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفاے راشدین کی تعبیر وتشریح جہاد سے مطابقت نہیں رکھتا تھا بلکہ خارجی اور تکفیری سوچ سے قریب تھا۔

اس نظریے کا اثر یہ ہوا کہ ایک طرف مصر میں جمال عبدالناصر کا قتل ہوا اور حکومت و طاقت حاصل کرنے کے لیے بے دریغ مسلمانوں کا قتل کیا گیا جس کے نتیجے میں سید قطب اور ان کے کچھ ہم نواؤں کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تو وہیں برصغیر میں الجہاد فی الاسلام کے چلتے بہت سارے نوجوان پڑوسی ملک پاکستان اور بھارت کے صوبہ کشمیر میں راہ راست سے بھٹک گئے، دوسری طرف داعش اور القاعدہ جیسی انتہا پسند تنظیموں نے بھی اسی فکر سے متاثر ہوکر اپنے شدت پسندانہ عمل کو خودساختہ جہاد سے تعبیر کیا جو قرآنی فلسفۂ جہاد کے سراسر خلاف ہے۔

مولانا ڈاکٹر ذیشان مصباحی صاحب نے دراصل جہاد کی اسی گتھی کو سلجھانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے، تاکہ مولانا مودودی اور سید قطب یا اس طرح کے وہ تمام اسکالرس جنہوں نے لفظ جہاد کی تعبیر وتشریح تشدد کے لیے کی ہے، اس کو ایکسپوز کیا جا سکے اور قرآن کے نظریۂ جہاد و امن اور فلسفۂ جنگ و صلح کو قرآن کے صحیح سیاق و سباق اور سیرت رسول کی روشنی میں سامنے لایا جاسکے، تاکہ مستقبل میں جہاد کے نام پر تشدد پسند تنظیمیں اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے اس پاکیزہ فلسفے کا غلط استعمال نہ کرسکیں اور ملک و بیرون ملک میں بسنے والے عوام وخواص جہاد کے لفظ سے خوف زدہ ہونے کے بجائے اس کے صحیح معنی اور مفہوم سے آگاہی حاصل کرسکیں۔

خسرو فاؤنڈیشن اس طرح کے تحقیقی اور اعتدال پسند لٹریچر کو عوام کے سامنے لانے کے لیے کوشاں ہے جس کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کی صحیح تصویر ملک وملت کے سامنے لائی جاسکے۔ حالیہ دنوں میں ''غزوۂ ہند'' کے مفروضے کو بے نقاب کرنے کے بعد ''تفہیم جہاد'' اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ثابت ہوگی۔ ان شاءاللہ!

مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کی ہمارے قارئین اسی طرح پذیرائی کریں گے جس طرح ماضی میں خسرو فاؤنڈیشن کی دیگر اشاعتوں کی کرتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن

کنوینر: خسرو فاؤنڈیشن، نئی دہلی

❁❁❁

حرف آغاز

عہد طالب علمی سے ہی مسئلۂ جہاد سے متعلق ہمیشہ سوالات رہے۔ اس پر مختلف مضامین اور کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا، لیکن تشفی نہیں ہوئی۔ اس موضوع پر لکھنے والے عام طور پر جہاد کی علت و غایت سے متعلق بنیادی سوالات سے صرف نظر کرتے ہوئے سارا زور ضمنی اخلاقیات اور مباحث پر صرف کر دیتے ہیں۔

تحصیل علم کے بعد مرشد عصر شیخ ابوسعید محمدی صفوی ۔حفظہ اللہ۔ کی عرفانی مجالس میں شرکت کا موقع میسر آیا۔ مختلف اوقات میں شیخ کے دیگر خیالات سے استفادے کے ساتھ جہاد و قتال سے متعلق بھی ان کے خیالات سننے کا موقع ملا۔ اندازہ ہوا کہ ان کی رائے میں خلافت راشدہ کے بعد ہی ۔ جزوی استثناءات کے ساتھ ۔ جہاد بالعموم ''شہادت حق'' کے بجائے ''مال غنیمت اور کشور کشائی'' سے عبارت ہو گیا۔ مزید یہ کہ فقہا کی بعض تعبیرات نے بھی موجودہ عہد کے علما کی تفہیم جہاد میں مشکلات پیدا کر دیں۔

گذشتہ ۱۲؍ سالوں سے حضرت شیخ کی اجازت اور رہ نمائی میں ''دعوت قرآن'' کے نام سے قرآن کی مختصر دعوتی عصری تفسیر لکھنے کی سعادت بھی حاصل کر رہا ہوں۔ یہ سلسلہ خانقاہ کے ترجمان ماہ نامہ خضر راہ میں اکتوبر ۲۰۱۲ء سے ہر ماہ شائع ہو رہا ہے۔ کوشش رہتی ہے کہ یہ سلسلہ مختصر ہی رہے، مگر بعض مقامات پر کسی ضروری عصری پہلو ہونے کے سبب کچھ طوالت بھی ہو جاتی ہے۔ جب البقرہ کی آیت (۱۹۰ ۔ ۱۹۴) پر پہنچا، جہاں ترتیب قرآن کے لحاظ سے پہلی بار جہاد کا ذکر آیا ہے تو یہ سلسلہ کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا۔ اب یہی حصہ حذف و اضافہ اور نظر ثانی کے بعد نذر قارئین ہے۔

منہج بحث اور مصادر و مراجع

اس کتاب میں ہم نے اپنا مطالعہ معروضی نہج پر رکھا ہے۔ ہم نے قرآن وسنت، اجماع وقیاس اور فقہ ومقاصد شرع کے اصولوں سے استدلال کیا ہے۔ علماے اسلام کے گراں قدر تفسیری وفقہی ذخیرے کے ساتھ ہی جہاد پر لکھی گئی قدیم وجدید کتابوں کا بھی حسب توفیق مطالعہ کیا ہے۔ کوشش کی ہے کہ آیات واحادیث کو سیاق وسباق سے سمجھا جائے، اسلام کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کو اجاگر کیا جائے اور علماے سلف کی ان آرا کو ترجیح دی جائے جو مقاصد دین، محاسن اسلام اور مطالب عصر سے ہم آہنگ ہوں۔ اس سفر میں ہم نے قدیم وجدید بہت سے اہل علم سے استفادہ کیا اور ان میں سے بعض سے ادب واحترام کے ساتھ اختلاف بھی کرنا پڑا۔ البتہ دل اس بات سے خوش ہے کہ جس نتیجے تک ہم پہنچے ہیں وہ مطالبات دین ودنیا سے یکسر ہم آہنگ ہے۔ اس نتیجے کی روشنی میں واقعی اسلام دین امن وسلام کی صورت میں سامنے آتا ہے اور خدا کے اس ابدی پیغام میں عامۃ الناس کے لیے ایک کشش اور جستجو محسوس ہوتی ہے۔

جہاد کے موضوع پر وجود میں آنے والے جدید لٹریچر کی بات کیجیے تو اس کا آغاز بیسویں صدی کے شروع میں مولانا مودودی (۱۹۷۹ء) کی الجہاد فی الاسلام (۱۹۳۰ء) سے ہوتا ہے، جس کے محسوس اثرات پوری صدی کو محیط ہیں۔ شرق تا غرب اسلامیات کا کون اسکالر ہوگا جو اس سے واقف نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ اس فکر کو امت نے اب بڑی حد تک مسترد کر دیا ہے۔ اس کی باضابطہ علمی شروعات خود مولانا مودودی کے خیمے سے ہوئی۔ ایک زمانے تک جماعت اسلامی کے سرگرم رکن رہے مولانا وحید الدین خان (۲۰۲۱ء) نے ''تعبیر کی غلطی'' اور دیگر کتابوں میں تفصیل سے اس کا علمی نقد وتجزیہ کیا اور اب یہ سلسلہ دراز ہے۔

گذشتہ صدی میں عالم عرب میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا اور بہت اچھا لکھا گیا ہے، بطور خاص جامعہ ازہر کے علما نے اس حوالے سے بہت اچھا کام کیا ہے۔ شیخ الازہر علامہ محمود شلتوت (۱۹۶۳ء) نے ۱۹۵۱ء میں اس موضوع پر ایک مختصر مگر واضح اور فکر انگیز کتاب القرآن والقتال لکھی اور اسلامی فلسفۂ جنگ کی امن پسندی کو واضح کیا۔ نامور اخوانی عالم علامہ یوسف القرضاوی (۲۰۲۲ء) کی کتاب فقہ الجہاد (۲۰۰۹ء) بھی اہم ہے، جب کہ ماضی میں ان کے بعض جنگی خیالات کافی متنازع رہے ہیں۔

اِدھر ماضی قریب میں جب سے علماے برصغیر کا عالم عرب سے ربط واستفادہ آسان ہوا ہے، اردو میں بھی بہترین کتابیں معرض وجود میں آنے لگی ہیں۔ ماہ نامہ الشریعہ پاکستان نے اس سیاق میں اچھے مضامین ومقالات شائع کیے ہیں۔ الشریعہ کی خصوصی اشاعت ''جہاد۔ کلاسیکی وعصری تناظر میں'' (مارچ ۲۰۱۲ء) قابل قدر ہے۔ بطور خاص ڈاکٹر مشتاق احمد، مولانا یحییٰ نعمانی اور جناب عمار خان ناصر کی نگارشات قابل استفادہ ہیں۔

حاصل مطالعہ

جہاد وقتال ایک وسیع موضوع ہے، جس کی متعدد جہات ہیں۔ اسی لیے لوگوں نے تفصیل سے اس پر لکھا بھی ہے۔ لیکن ان مباحث میں عام طور پر بنیادی سوال جو فلسفۂ جہاد یا علتِ قتال سے متعلق ہے، وہ گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لیے راقم نے بطور خاص اسی سوال کو موضوع بحث بنا کر اس سے متعلق ضروری مباحث اور اس پر وارد ہونے والے اہم اعتراضات وشبہات کا واضح انداز میں ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ یوں تو جہاد۔ اچھی کوشش۔ سب پر ہر وقت لازم ہے، مگر اسلام میں جہاد بمعنی جنگ وقتال کوئی ایسا پر پیچ فلسفہ نہیں جو عقل واخلاق کے خلاف ہو، یا موجودہ عالمی نظام کے تناظر میں اس کو سمجھنا مشکل ہو۔

۲۔ اسلام میں حرب وضرب اور جنگ وجدل کے جواز کی وہی بنیاد ہے جسے کوئی بھی امن پسند صاحبِ فکر انسان وجہِ جنگ بتا سکتا ہے۔ اسلام کی جنگی بنیادیں دراصل آفاقی سچائیاں ہیں، جن کو کوئی بھی سنجیدہ انسان رد نہیں کر سکتا۔

۳۔ اسلام میں جنگ کا جواز محض اضطراری حالت میں فتنہ وفساد اور ظلم وجبر کے خاتمے اور امن وامان اور آزادی فکر وضمیر کے قیام کے لیے ہے اور یہ ایک ایسی معقول اور فطری بات ہے جس میں کوئی بھی باشعور انسان شبہہ نہیں کر سکتا۔

۴۔ اسلام بہر صورت امن عامہ اور حریت عامہ کا داعی اور خوف ودہشت اور ظلم وجبر کے خلاف ہے۔ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کا متقاضی ہے جو خوف اور بھوک سے پاک ہو۔ (قریش: ۴) البتہ ان مقاصد کے لیے برپا کی جانے والی جنگ میں وہ رضائے الٰہی کی طلب کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔ اس کے بغیر کی جانے والی ہر کوشش اسلام کی نظر میں بے سود ہے۔

شکر واعتذار

اللہ کریم کا ہزار ہا ہزار شکر واحسان کہ اسی کے فضل وتوفیق سے اسلامی قانون جنگ سے متعلق چند اہم شبہات کا ازالہ بعنوان ''تفہیم جہاد-امن اسلامی کا الٰہی منشور'' (۱۴۴۴ھ(۱)) آپ کی خدمت میں حاضر کر رہا ہوں۔

ہمیں بالکل ہی یہ دعویٰ نہیں کہ ہمارے فہم واستدلال میں نقص نہیں ہوسکتا، یا اس پر اضافہ نہیں ہوسکتا، بلکہ ہمیں تو اس کا انتظار رہے گا کہ اہل علم اس بے مایہ کی اصلاح فرما کر اسے سہو وخطا سے بچانے میں اس کی مدد کریں گے۔ لیکن موجودہ صورت میں غایت درجہ فرحت وانبساط ضرور ہے کہ حق تعالیٰ نے ان چند اوراق میں اپنے ایک انتہائی کمتر عاصی بندے سے یہ اہم کام لیا۔ فلہ الحمد والمنۃ!

کتاب کے آخر میں فاضل گرامی مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی صاحب کے شکریے کے ساتھ ان کی ایک انتہائی اہم تحریر ''شدت پسند تنظیموں کی فکری بنیادیں'' بھی بطور ضمیمہ شامل ہے۔ یہ تحریر کتاب کے ایک اہم تشنہ پہلو کو سیراب کر رہی ہے۔ اللہ کریم انہیں جزائے خیر بخشے۔

آخر میں حضرت مرشد گرامی کا شکریہ واجب ہے جن کی توجہ اور توجیہ اس کتاب کی تحریر واشاعت کا سبب بنی۔ اسی طرح استاذ گرامی پروفیسر اختر الواسع صاحب کا شکریہ بھی ضروری ہے جنہوں نے اپنے کلماتِ خیر سے ہمارا حوصلہ بڑھایا۔ مخدوم مکرم شیخ حسن سعید صفوی، مولانا محمد ضیاء الرحمٰن علیمی، مولانا محمد احمد سلفی، مولانا محمد زکی سعیدی، مولانا محمد اصغر علی مصباحی، ڈاکٹر محمد علی اور دیگر احباب کا خصوصی شکریہ جن کی اصلاح وتصحیح اور نظر ثانی کتاب کی علمیت وافادیت میں اضافے کا سبب بنی۔ ناسپاسی ہوگی اگر یہاں بڑے بھائی ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن کا ذکر نہ ہو، جن کی توجہ وعنایت سے خسرو فاؤنڈیشن، دہلی کے توسط سے یہ کتاب قارئین تک پہنچ رہی ہے۔

اللہ کریم ان تمام محسنین کو اپنی خصوصی نوازشات سے سرفراز فرمائے۔ آمین!

۶/جون ۲۰۲۴ء

ذیشان احمد مصباحی

---

(۱) یہ مرشد گرامی کا دیا ہوا تاریخی نام ہے، جو اس کے سال تصنیف کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مفہوم جہاد

اسلام ایک جامع نظام حیات ہے، جو بیک وقت جسم، عقل اور روح کے تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے۔ حیات انسانی کے ان تینوں پہلوؤں کی تکمیل وتسکین کے لیے اس نے جہاد، اجتہاد اور مجاہدہ کو اپنا آلۂ کار بنایا ہے۔ یہ تینوں امور ''جہد'' کے مادے سے مشتق ہیں۔ جہد یعنی خیر کی کوشش ان تینوں میں قدرِ مشترک ہے۔ حیات انسانی کو صحت مند، پرامن اور پرسکون رخ پر رواں دواں رکھنے کے لیے مذکورہ بالا تینوں امور نہایت ضروری ہیں۔

جہاد کا تعلق جسم انسانی یعنی انسان کے مادی سکون وقرار سے ہے۔ دنیا میں عدل وانصاف کے قیام اور ظلم وجبر کے خاتمے کے لیے یہ فوجی اور قانونی طریقہ اپناتا ہے۔ حیات انسانی کی پرامن اور بے ضرر بقا کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے، بشرطیکہ اپنی درست بنیادوں پر قائم ہو۔ زیر نظر کتاب اسی کی درست تعبیر وتوجیہ کے لیے لکھی گئی ہے۔

اجتہاد کا تعلق عقل انسانی یعنی علمی تحقیق وتفکیر سے ہے، جو بدلتے حالات میں انسانی معاشرے کی صالح، مفید اور اخلاقی قدروں کے تعین اور ترقی پذیر معاشرے کو فساد سے بچانے اور صلاح سے ہم آہنگ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ نہ ہو تو انسانی معاشرہ یا تو ترقی سے رک جائے، یا پھر ترقی کی اس سرحد پر پہنچ جائے جہاں انسانیت کے سوا سب کچھ ہوتا ہے۔

مجاہدہ کا تعلق روح انسانی یعنی تزکیۂ نفس اور احسان (تصوف) سے ہے۔ اس سے انسان روحانی سکون پاتا ہے اور اس کی اخلاقی وروحانی قدروں کی حفاظت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے خلق اور حق کا عرفان ہوتا ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان محض ایک عام جانور بن جائے۔

علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں ایک مقام پر لکھا ہے:

''انسانیت کو آج تین چیزوں کی ضرورت ہے:

۱۔کائنات کی روحانی تعبیر، ۲۔فرد کی روحانی تشکیل اور ۳۔ایسے عالم گیر نوعیت کے بنیادی اصول جو روحانی بنیادوں پر انسانی سماج کی نشوونما میں رہ نما ہوں۔''(۱)

حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں ضرورتیں مجاہدہ یا نظام تصوف واحسان سے ہی پوری کی جاسکتی ہیں۔تاہم اس کے ساتھ اجتہاد یعنی اس شرعی تفکیر وتدبیر کی بھی ضرورت ہے، جس کی بنیادیں وحی میں پیوست ہوتی ہیں۔ پھر ان تینوں امور کی بازیافت کے بعد ان کے پر امن دوام وبقا کے لیے جہاد یعنی عادلانہ قانونی نظام کا ہونا بھی ناگزیر ہوگا۔

الغرض! جہد کے یہ تینوں مشتقات؛ اجتہاد، جہاد اور مجاہدہ۔بشرطیکہ اپنی حقیقی صورت میں ہوں۔یقین، عمل اور محبت کے متوازی ہیں، جن کے بارے میں اقبال نے کہا ہے:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم

جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

لغوی اور شرعی مفہوم

جہاد ایک عربی لفظ ہے، جس کا مادہ (*root word*) جہد ہے۔ جہد کے معنی کوشش کے آتے ہیں۔عربی زبان کا اصول یہ ہے کہ کسی لفظ میں اگر حروف بڑھتے جائیں تو معنی کے اندر قوت وشدت بھی بڑھتی جائے گی۔اس اعتبار سے اس کے معنی سعی بلیغ کے ہوئے۔

ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ جہاد عربی میں باب مفاعلت کا مصدر ہے۔ باب مفاعلت کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں فاعل ومفعول کے بیچ دوطرفہ کشاکش پائی جاتی ہے۔ اب اس کے معنی ہوئے کہ ایسی بڑی کوشش جس کو دبانے کے لیے کوئی دوسرا شخص بھی کھڑا

---

(۱)Humanity needs three things today; a spiritual interpretation of the universe, spiritual emancipation of the individual, and basic principles of a universal import directing the evolution of human society on a spiritual basis .(*The Reconstruction of Religious Thought in Islam, last paragraph of sixth lecture*)

ہو۔ گو یا جہاد صرف یہ نہیں ہے کہ آپ اپنا سامان طاقت سے اٹھالیں، بلکہ جہاد یہ ہے کہ آپ کا سامان کوئی دوسرا چھین رہا ہو اور آپ اپنا سامان اس کے ہاتھ سے چھڑانے کے لیے اپنی کوشش اور طاقت صرف کر رہے ہوں۔

جہاد کا یہ لغوی مفہوم ہے جو اپنے لفظ و مادہ اور صیغہ (structure) سے واضح ہے۔ عرف میں اس کے اندر مزید ایک مفہوم شامل ہے اور وہ یہ کہ اگر چہ از روئے لغت ہر بڑی کوشش کو جہاد کہا جا سکتا ہے، خواہ وہ کوشش اچھی ہو یا بری، لیکن عوام میں اسے ہمیشہ اچھی کوشش کے ساتھ خاص سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے کسی مظلوم کو اس کا حق دلانے کے لیے جو کوشش کی جائے اسے جہاد کہا جائے گا، لیکن کسی غریب کا مال لوٹنے کے لیے جو محنت و کوشش کی جائے، اسے جہاد نہیں، فساد فی الارض، ظلم اور بربریت کہا جائے گا۔

اسلام نے اس معنی کی مزید تخصیص کر دی ہے اور وہ تخصیص ہے فی سبیل اللہ کی تخصیص، یا بلفظ دیگر رضائے مولیٰ کی تخصیص۔ یعنی اسلامی شریعت کی اصطلاح میں صرف کوشش کو جہاد نہیں کہا جاتا، صرف سعی بلیغ کو بھی جہاد نہیں کہا جاتا، صرف اچھی کوشش کو بھی جہاد نہیں کہا جاتا، بلکہ اسلام کی نظر میں جہاد وہ بڑی اچھی کوشش ہے جو کسی کار خیر میں رضائے مولیٰ کی خاطر انجام دی جائے۔

جہاد کے اسلامی مفہوم کے حوالے سے ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ اسے جنگ کے ساتھ خاص سمجھ لیا جاتا ہے۔ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ بہت سے لوگ اسے مذہبی جنگ (धर्म युद्ध) یا مقدس جنگ (holy war) کا ہم معنی سمجھ لیتے ہیں، جب کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ جہاد کا ایک حصہ یا ایک قسم مذہبی جنگ ضرور ہے، لیکن مذہبی جنگ ہی کل جہاد نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اسلام میں جہاد اس وقت فرض تھا جب جنگ کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا** (الفرقان: ۵۲) منکرین کے نقش قدم پر مت چلو، بلکہ قرآن کے ذریعے ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو!

واضح رہے کہ یہاں بِهِ سے مراد قرآن ہے۔ یہ حضرت ابن عباس کی تفسیر ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کے ذریعے جو جہاد ہوگا، اس کی شکل علمی اور نظریاتی مکالمے کی ہی ہوگی۔

قرآن کوئی ہتھیار تو ہے نہیں کہ اس کے ذریعے جنگ کی جائے اور لوگوں کو قتل کیا جائے۔
امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر میں اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

''یہاں جہاد سے مراد عمل اور دعا میں کوشش کرنا ہے۔ بعض حضرات نے اسے قتال اور جنگ کے معنی میں بھی لیا ہے اور ایک تیسرے گروہ نے اس کے مفہوم میں دونوں باتوں کو شامل رکھا ہے، جب کہ پہلی تفسیر ہی اقرب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سورہ مکی ہے اور جہاد کا حکم ہجرت کے ایک زمانے کے بعد نازل ہوا۔''

ہاں! یہ سچ ہے کہ ازالۂ فتنہ وفساد اور قیام عدل وانصاف کے لیے جنگ کرنا بھی جہاد کی ایک قسم ہے، لیکن یہی کل جہاد نہیں ہے۔ اس جہاد کے لیے قرآن نے جس خاص لفظ کا استعمال کیا ہے وہ قتال ہے۔ قرآن میں اس کا پہلا حکم اسی لفظ کے ساتھ آیا ہے۔ ارشاد ہے: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۳۹ (حج) ''جن کے اُوپر مظالم ڈھا کر اُن پر جنگ تھوپی گئی ہے، اُنھیں جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔'' ایک دوسری آیت میں اس منصفانہ جنگ کا حکم اس طرح صادر ہوا: وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ۱۹۰ (بقرہ) ''جو تم سے جنگ کریں، ان سے اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور حد سے نہ بڑھو۔''

ہاں! یہ ضرور ہے کہ عام طور پر لفظ جہاد اس قتال کے معنی میں ہی متعارف ہو گیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ حقیقت میں جہاد کو صرف اسی مفہوم تک محدود رکھا جائے۔

عقلی توجیہ

مرشد عصر شیخ ابوسعید محمدی صفوی دام ظلہ کے بقول جہاد، جو ''سعی خیر'' کے ہم معنی ہے اور جس کا آغاز قُوْا أَنْفُسَكُمْ (۱) سے ہوتا ہے، ہر شخص پر ہر وقت فرض ہے۔ جہاں تک ''جہاد بمعنی قتال'' کا سوال ہے تو یہ آخری علاج کے طور پر operation سے عبارت ہے۔ ڈاکٹر آخری حد تک پرہیز اور دوا کے ذریعے علاج کرتا ہے، آپریشن اس وقت کرتا ہے جب علاج کی کوئی دوسری صورت نہ بچی ہو۔

---

(۱) قُوْا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (خود کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم سے بچاؤ۔ (تحریم:٦)

اسے ایک مثال سے سمجھیے! نئی صدی کے آغاز میں امریکا نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ ''operation'' کے نام پر ہی مفروضہ ظلم، غاصبانہ تسلط، شہریوں کی مکمل آزادی اور نامعلوم دہشت گردوں کی تلاش کے دعوے کے ساتھ عراق وافغانستان وغیرہ میں متعدد جنگیں لڑیں جس کے نتیجے میں لاکھوں انسان ہلاک ہوئے اور شہر کے شہر تباہ ہوگئے۔ اس طرح تطبیق (application) کی صحت سے قطع نظر یہ ''اصول جنگ'' یقیناً درست ہے اور بلا تمثیل اسی اصول کے تناظر میں فلسفۂ جہاد کو بھی سمجھنا چاہیے۔

اسی سے ملتی جلتی ایک دوسری اصطلاح بھی نئے عہد میں سننے میں آئی ہے۔ یہ انسدادی حملہ یا سرجیکل سٹرائیک (surgical strike) کی اصطلاح ہے۔ اس میں مکمل جنگ کے بجائے کسی حریف ملک کے مخصوص ہدف کو چُنا جاتا ہے اور اس پر کارروائی کی جاتی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب حریف ملک ہم پر حملہ آور ہونے یا نقصان پہنچانے کی تیاریاں کر رہا ہو اور سرجیکل اسٹرائک کے ذریعے ہم اس کی پلاننگ کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں اسرائیل کے ذریعے عراق پر بمباری، ۱۹۸۶ء میں امریکا کے ذریعے طرابلس اور بنغازی پر بمباری، ۲۰۱۶ء میں انڈیا کے ذریعے پاکستان پر بمباری، ۲۰۲۰ء میں آذربائیجان کے ذریعے آرمینیا پر بمباری اور ۲۰۲۴ء میں ایران کے ذریعے پاکستان پر بمباری کو سرجیکل اسٹرائک کے ذیل میں ہی رکھا اور دیکھا جاتا ہے۔

جہاد، فساد کی ضد ہے!

ایک بات جو اور بہت اہم ہے، وہ یہ کہ جہاد فساد کے خلاف ہے۔ جہاد کی مشروعیت صرف اسی وجہ سے ہوئی ہے تاکہ دنیا سے فساد کا خاتمہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جس قدر جہاد کی فضیلت اور تحسین وارد ہے، اسی قدر ظلم وفساد، بغاوت وبربریت اور دہشت گردی کی مذمت وارد ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کوئی حکومت اس وقت تک جنگ کا آغاز نہیں کرسکتی جب تک کہ اس کے اوپر جنگ یا ظلم مسلط نہ کردیا گیا ہو۔ لیکن اس صورت میں بھی اسلامی نقطۂ نظر سے اسے لکشمن ریکھا (حد اعتدال) کو cross کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ کچھ اپنوں کی سادگی اور کچھ دوسروں کی چالاکی کے سبب ایک عرصے سے جہاد کو فساد کے مفہوم میں ہی متعارف کردیا گیا ہے، چنانچہ جس ظلم

وتجاوز کو روکنے کے لیے جہاد آیا تھا، اب اسی ظلم وتجاوز کو جہاد کے روپ میں پیش کیا جارہا ہے۔داعش اور القاعدہ کے جہاد کو اسی ذیل میں رکھا جاسکتا ہے۔تاریخ اسلام میں مفہوم جہاد کے اوپر یہ سب سے بڑا ظلم ہے۔

یہ فلسفے کی اس کہانی کی طرح ہے کہ ایک دن جھوٹ نے سچ سے کہا، تالاب کا پانی بہت اچھا ہے، چلو نہاتے ہیں۔سچ کو تامل ہوا، چیک کیا تو بات سچ تھی، وہ جھوٹ کے ساتھ تالاب میں نہانے لگا، اتنے میں جھوٹ تیزی کے ساتھ باہر نکلا، جلدی سے سچ کا لباس پہنا اور فرار ہوگیا۔جب سے سچ شرمِ بے لباسی میں آبادی سے باہر دور صحرا میں چھپا ہوا ہے اور جھوٹ سچ کا لباس زیب تن کیے ہوئے، شہروں میں پھر رہا ہے۔

الحاصل! جہاد لغت میں سعی بلیغ اور شریعت میں قیام خیر کی جد و جہد کو کہتے ہیں، جس کی ایک قسم قتال بھی ہے، جو فساد نہیں بلکہ رفع فساد سے عبارت ہے۔ ۞ ۞ ۞

اقسام جہاد

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

الجهاد ماض منذ بعثني الله عز وجل إلى أن يقاتل آخر أمتي الدجال لا يبطله جور جائر ولا عدل عادل.(۱)

جہاد اس دن سے جاری ہے جس دن اللہ نے مجھے مبعوث فرمایا اور اس وقت تک جاری رہے گا جب میرا آخری امتی دجال سے برسرپیکار ہوگا۔ کسی ظالم کا ظلم یا کسی عادل کا عدل جہاد کو موقوف نہیں کرسکتا۔

اس سے قطع نظر کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں جہاد محض جنگ سے عبارت نہیں ہے، چوں کہ جنگ کے مفہوم میں جو جہاد فرض ہوا، وہ ہجرت کے بعد مدینے میں ہوا۔ بعثت کے وقت بلکہ اس کے کئی سالوں بعد تک جہاد بمعنی ظالم کے خلاف جنگ فرض نہیں تھا۔ اس سے واضح ہوا کہ شریعت میں جہاد کا مفہوم بہت ہی وسیع ہے۔ یہ ظلم و جبر اور باطل کے خلاف ایک جہد مسلسل ہے، خواہ زبان کے ذریعے ہو خواہ قلم کے ذریعے، فکر کے ذریعے ہو یا عمل کے ذریعے، انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی سطح پر، عوامی سطح پر ہو یا حکومتی سطح پر۔ اس کا ضعیف ترین درجہ جہاد بالقلب ہے، یعنی ظلم و جبر اور شر کو دل سے برا جاننا۔ ظاہر ہے کہ دل پر کسی ظالم و جابر کا تسلط نہیں ہوتا۔ اس لیے کم از کم اس مفہوم میں جہاد ہر وقت اور ہر شخص پر فرض ہے۔

---

(۱) سنن ابوداؤد (۲۵۳۲)، سنن سعید بن منصور (۲۳۶۷)، مسند ابویعلی (۴۳۱۱) وغیرہ۔ اس حدیث کو شیخ شعیب ارناؤوط نے سنن ابوداؤد کی تعلیق میں حسن لغیرہ کہا ہے۔

بہرکیف !اس حدیث پاک سے جہاں یہ بات واضح ہے کہ جہاد فرض مسلسل ہے، وہاں یہ بھی واضح رہے کہ جنگ فرضِ مسلسل نہیں ہے۔ جنگ تو اصلاً غیر مطلوب اور ناپسندیدہ عمل ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف ہمیشہ جنگ لڑنے کی بلکہ جنگ اور مڈبھیڑ کی تمنا کرنے کی بھی مذمت کی ہے۔امام مسلم نے اپنی کتاب میں ایک پورا باب ہی اس عنوان سے باندھا ہے:

بَابُ كَرَاهَةِ تَمَنِّي لِقَاءِ الْعَدُوِّ، وَالْأَمْرِ بِالصَّبْرِ عِنْدَ اللِّقَاءِ. (کتاب الجہاد والسیر)

دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا کرنا بری بات ہے اور مڈبھیڑ ہوجائے تو ثابت قدم رہنا ضروری ہے۔

اس باب میں دو باتیں بتائی گئی ہیں۔ایک یہ کہ جنگ اپنی اصل کے اعتبار سے اچھی اور قابل ترجیح چیز نہیں ہے، اس لیے اس کی آرزو کرنا بھی اچھی بات نہیں ہے، البتہ جب دشمن گھیر لے اور self defence مجبوری بن جائے تو اس وقت پیٹھ دکھا کر بھاگنا اور بزدلی کا مظاہرہ کرنا، یا رونا گڑگڑانا، یہ بھی مردوں کا شیوہ نہیں۔ایسے موقع پر ’’تنگ آمد بجنگ آمد‘‘ کا اصول کام کرتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ جب جنگ اصلاً اچھی بات نہیں ہے، پھر جہاد کی مسلسل فرضیت کے کیا معنی ہیں؟ تو اس کا اجمالی جواب یہ ہے کہ دراصل جہاد نام ہے خیر کے لیے جدوجہد کا جو فرض مسلسل ہے، البتہ اس کے تفصیلی جواب کے لیے اقسام جہاد کو سمجھنا ضروری ہے،جس سے معلوم ہوگا کہ ساری غلط فہمی اس پر مبنی ہے کہ جہاد کو صرف جنگ کے معنی میں محدود کردیا گیا ہے۔

جہاد کی الگ الگ جہتوں سے کئی قسمیں ہیں، جن میں تین قسمیں بہت نمایاں ہیں:

قسم اول۔ جہاد اصغر

قیام امن وامان اور ازالۂ ظلم وفساد کے لیے مسلح جدوجہد۔ یہ جہاد جنگ کی صورت میں ہوتا ہے۔عربی میں اس کے لیے خاص لفظ قتال موجود ہے۔یہی عام طور پر جہاد کا متعارف مفہوم ہے۔زیادہ تر اسی پر بحثیں ہوتی ہیں اور اسی پر سوالات کیے جاتے ہیں، جب کہ اہل بصیرت کی نگاہ میں یہ جہاد اصغر ہے۔ یہ کتاب اسی سے متعلق ہے۔

جہاد کی یہ قسم وزارت دفاع (ministry of defence) سے متعلق ہے۔جس طرح تاریخ کے ہر دور میں حکومتوں کا ایک شعبہ ملکی دفاع سے متعلق سپاہ وسلاح کے لیے مختص رہا ہے، اسلام نے بھی بعض اصولی اور اخلاقی اصلاحات کے ساتھ اسے باقی رکھا ہے۔

قسم دوم- جہاد کبیر

فکر و نظر کی دنیا میں صحت کی تلاش اور حق کی سربلندی کے لیے علمی جدوجہد۔اس میں تیغ وسپاہ کی حاجت نہیں ہوتی۔اس جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم اجتہاد ہے، جس میں وحی کے اجالے میں موجودہ دنیا کے احکام ومسائل کے حل تلاش کیے جاتے ہیں۔ جہاد کے سیاق میں عام طور پر اس کا ذکر ہی نہیں ہوتا، جب کہ اسلام نے سب سے پہلے اسی جہاد کا حکم دیا ہے۔حکم ہوا:

وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا (الفرقان:۵۲)

قرآن لے کر ان منکرین کے خلاف زبردست جہاد کرو!

یہ آیت اگرچہ دعوت حق کے علمی اثبات کے تناظر میں نازل ہوئی ہے، لیکن اس کے عموم میں تمام تر لسانی، قلمی، علمی، فکری، فلسفی، عقلی، تعلیمی، دعوتی، سیاسی، تدبیری اور اخلاقی معرکہ آرائیاں شامل ہیں۔ ملک وملت اور سماج وسیاست میں پھیلے مختلف النوع امراض ومسائل کے خلاف جدوجہد، صحت، معیشت، تربیت، ماحولیات اور اخلاقیات کی اصلاح کے لیے اٹھایا جانے والا ہر قدم، جہاد کے اسی باب سے تعلق رکھتا ہے۔

جس طرح جہاد اصغر وزارت دفاع سے متعلق ہے، اسی طرح جہاد کبیر تعلیمی، اقتصادی اور دیگر فلاحی وتعمیری وزارتوں سے متعلق ہے۔ جہاد اصغر فوجیوں کا کام ہے، جب کہ جہاد کبیر علما، محققین، مفکرین، دانشوروں، صحافیوں اور دیگر ماہرین کا کام ہے۔

قسم سوم- جہاد اکبر

اپنے نفس کو منفی خواہشات اور شر پسندی سے روکنے کے لیے اپنے آپ سے داخلی جدوجہد۔ یہ عارفین اور صوفیہ کا موضوع ہے۔ وہ اس کے لیے اسپیشل لفظ مجاہدہ کا استعمال کرتے ہیں۔صوفیہ نے اپنی خانقاہوں کو اسی قسم کے جہاد کے لیے مختص رکھا اور آج بھی دنیا کے مختلف خطوں میں -اپنے تمام تر وصف زوال کے باوجود-اس کی شمع جلائے ہوئے ہیں۔ یہ سب سے بڑا جہاد ہے، کیوں کہ اس میں خود سے لڑنا ہوتا ہے اور خود سے کی جانے والی جنگ بہت بڑی جنگ ہوتی ہے۔ بقول شیخ ابراہیم ذوق:

نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا

جہاد بالنفس جہاد اکبر ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔نصوص شرع اور مقاصد دین پر نظر رکھنے والے اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ یہ جہاد ہر شخص کے لیے ہر وقت فرض ہے۔زندگی کی ہر تگ ودو اور جدوجہد کی ساری مساعی کی قبولیت اسی جہاد اکبر پر موقوف ہے۔ یہ تصحیح نیت، تحصیل تقویٰ، ترک شہوات اور اعمال واحوال صالحہ سے قلب وروح کو مزین کرنے کی ظاہری وداخلی جدوجہد سے عبارت ہے۔ یہ نہ ہوتو جہاد اصغر اور جہاد کبیر بھی مقبول نہ ہوں۔ظلم وجبر کے خاتمے کے لیے سیف وسنان چلاتے وقت بھی تزکیۂ قلب اور تجلیۂ روح مطلوب ہے۔ارشاد باری ہے:قَدۡ أَفۡلَحَ مَنۡ زَكَّاهَا وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسَّاهَا (الشمس:۹، ۱۰) کامیاب وہی ہوا جس نے نفس کو پاک وصاف کیا، جس نے اسے آلودہ کیا وہ ناکام ونامراد رہ گیا۔

’’جہاد بالنفس جہاد اکبر ہے‘‘اس کی تائید ایک حدیث پاک سے بھی ہوتی ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک جنگ سے واپسی کے موقع پر ارشاد فرمایا:رجعنا من الجهاد الاصغر إلى الجهاد الاكبر. مسند الفردوس میں یہ الفاظ وارد ہیں:قدمتم من الجهاد الاصغر إلى الجهاد الاكبر مجاهدة العبد هواه. تم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف آئے، جو کہ جہاد بالنفس ہے۔محدثین نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے، لیکن جو معنی سطور بالا میں بیان کیا گیا ہے، اس کے قوی ہونے میں کسے شبہہ ہوسکتا ہے۔مزید یہ کہ اس کی تائید مختلف آیات واحادیث صحیحہ سے ہوجاتی ہے۔مثلاً یہ حدیث صحیح: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:الۡمُجَاهِدُ مَنۡ جَاهَدَ نَفۡسَهُ. فی الواقع مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔(ترمذی: ح:۱۶۲۱)

جہاد کی ان تینوں اقسام کو علی الترتیب عند الضرورۃ، فرض کفایہ اور فرض عین کہا جاسکتا ہے۔تاہم بعض ایسی صورتیں درپیش ہوتی ہیں جن میں جہاد اصغر بھی فرض عین ہوتا ہے، مثلاً کسی جگہ دشمنوں کا اچانک حملہ ہوجائے تو وہاں کے تمام افراد پر ضروری ہوتا ہے کہ اپنی، اپنے اہل وعیال اور اپنی قوم، ملک اور ملت کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہوجائیں۔ اسی طرح بعض اوقات جہاد کبیر بھی فرض عین ہوجاتا ہے جب کہ سارے لوگ اس سے غافل ہوں۔

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جہاد اصغر، جہاد کبیر اور جہاد اکبر مخصوص اصطلاحات ہیں۔ اپنے مقام پر تینوں کی یکساں اہمیت ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ ان میں سے کوئی کم اہمیت کا حامل ہے اور کوئی زیادہ کا۔

ایک دوسری توجیہ

جہاد کی ان تینوں قسموں کو ایک حدیث میں ایک الگ انداز سے بیان کیا گیا ہے:

مَنْ رَأَى مُنْكَرًا فَاسْتَطَاعَ أَنْ يُغَيِّرَ بِيَدِهِ فَلْيُغَيِّرْ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ بِلِسَانِهِ فَبِقَلْبِهِ، وَذَلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ.

تم میں جو شخص کوئی برائی دیکھے، اگر اس کے پاس طاقت سے روکنے کی استطاعت ہو تو اسے طاقت سے روک دے، اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روکے، اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو اپنے دل سے روکے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔(۱)

اس حدیث میں غور کرنے سے بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں:

اس سے پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ شر سے نبرد آزمائی کے تین درجے ہیں:

۱۔ جہاد بالقوۃ، یہ حکام اور ان کے ماتحت فوج، پولس، قاضی اور منصب دار کا ہے۔ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی اپنی سطح پر یہ کام دیگر ذمہ داران بھی کر سکتے ہیں۔ یہ جہاد اصغر کے باب سے ہے۔

۲۔ جہاد باللسان، یہ علما، واعظین، فلاسفہ، حکما، اہل دانش، صحافی اور دیگر ارباب فکر و قلم کا کام ہے۔ اس کام میں بھی انسانی آداب، اخلاقی اصول اور قانونی حدود کی پاس داری ضروری ہے۔ یہ جہاد کبیر کے باب سے ہے۔

۳۔ جہاد بالقلب، یہ ہر شخص کا ہر وقت کا فریضہ ہے۔ اچھے کو اچھا اور برے کو برا سمجھنا سب کے لیے ہر وقت ضروری ہے۔ ظلم کی تائید کبھی نہیں کی جاسکتی، کم از کم دل سے تو برا جانا ہی جائے گا۔ یہ جہاد بالنفس کے باب سے ہے۔

---

(۱) سنن ابن ماجہ، أَبْوَابُ إِقَامَةِ الصَّلَوَاتِ وَالسُّنَّةِ فِيهَا، بَابُ مَا جَاءَ فِي صَلَاةِ الْعِيدَيْنِ)

اس حدیث میں ذرا گہرے تدبر سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ شر کے خلاف لڑنے کے مختلف درجے ہیں، جو جس درجے کا ہو، اسے اپنے درجے سے لڑنا چاہیے، نہ یہ کہ جوش جہاد اور جذبۂ خیر سے مغلوب ہو کر وہ کام کرنے لگے، جس کا وہ مکلف ہی نہ ہو۔

تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ دل سے برا جاننا بھی بہرحال ایمان ہی کا حصہ ہے، اس لیے تیسرے درجے کے لوگ صرف دل سے برا جانیں، قانون اپنے ہاتھ میں ہرگز نہ لیں۔

دفاعی یا اقدامی؟

جہاد اصغر یعنی اسلامی نظام جنگ کی ایک تقسیم دفاعی اور اقدامی جہاد کی طرف بھی کی جاتی ہے، جس کی حیثیت محض لفظی تقسیم کی ہے۔ اس پر بڑا غوغا ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اسلام میں صرف دفاعی جنگ ہے، اسلام اقدامِ جہاد کو درست نہیں سمجھتا۔ اس کے برخلاف دوسری رائے یہ ہے کہ اسلام کا کام روحانی اور مادی سطح پر امن کا قیام اور ظلم کا خاتمہ ہے اور اس کے لیے صرف دفاعی ہی نہیں بعض دفعہ اقدامی جنگ بھی ناگزیر ہوتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس اختلاف کی حیثیت نزاع لفظی سے زیادہ کی نہیں ہے۔ جیسا کہ اس کتاب میں فلسفۂ جہاد کی وضاحت میں لکھا گیا ہے کہ اسلام میں جواز جنگ کی واحد علت، ظلم و فساد کا خاتمہ اور قیام امن و امان ہے۔ اب اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ کسی کے پنجۂ ظلم و جبر سے اپنی آزادی کے لیے لڑنا۔

۲۔ کسی کے پنجۂ ظلم و جبر سے دوسروں کی آزادی کے لیے لڑنا۔

پہلی صورت کو آپ دفاعی جنگ اور دوسری کو اقدامی جنگ کہہ سکتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ پہلی صورت میں آپ پر ظلم مسلط ہے اور اپنے دفاع اور بچاؤ کے لیے لڑ رہے ہیں، جب کہ دوسری صورت میں آپ پر کسی نے جنگ یا ظلم مسلط نہیں کیا ہے، ظلم کہیں اور ہو رہا ہے، لیکن آپ خود بڑھ کر وہاں ظالم کے خلاف اقدام کر رہے ہیں۔ اس اعتبار سے اسے اقدامی جنگ کہنا بجا ہے۔ لیکن اس واقعے کو آپ ایک دوسری جہت سے بھی دیکھ سکتے ہیں اور وہ یہ کہ پہلی صورت میں آپ اپنی مظلومیت کا دفاع کر رہے ہیں اور دوسری صورت میں آپ دوسروں کی مظلومیت کا دفاع کر رہے ہیں، اس طرح دونوں صورتوں میں آپ کی جنگ محض دفاعی ہی رہتی ہے۔

اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جنگ کے جواز کی بنیاد تو محض ظلم و جبر کا خاتمہ کرنا ہے۔ یہ ظلم و جبر کبھی واقع ہوتا ہے اور کبھی یقینی طور پر واقع ہوا چاہتا ہے۔ جہاد ان دونوں صورتوں میں روا ہے۔ ان میں پہلی صورت دفاعی کی ہے اور دوسری اقدامی کی۔ لیکن ایک اعتبار سے دونوں کو بھی دفاعی کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ دونوں ہی صورتوں میں اپنا دفاع پایا جا رہا ہے۔ پہلی صورت میں واقع ظلم و جبر کا دفاع اور دوسری صورت میں متوقع ظلم و جبر کا دفاع۔

اسی عقدے کے حل کے لیے ایک تیسری نئی اصطلاح دفاعی-اقدامی (defensive-aggressive) بھی سامنے آئی ہے۔

اسے ایک مختلف زاویے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے، جس کا ذکر دلائی لاما نے اپنے ایک خطاب میں کیا تھا۔(۱) وہ یہ کہ کبھی جنگ نتیجے کے اعتبار سے امن ہوتی ہے اور کبھی امن نتیجے کے اعتبار سے جنگ ہوتا ہے۔ ظالموں اور غاصبوں سے لڑنا، بظاہر جنگ ہے، لیکن نتیجے کے اعتبار سے امن و امان کی ایک نئی صبح کی نوید ہے۔ اسی طرح سے بعض دفعہ کوئی شخص یا ملک ہمارے یا ہمارے ملک کے سامنے منہ بھرائی کرتا ہے اور پس پشت خنجر گھونپنے کی سازشیں کرتا ہے۔ جب اس کا علم یقینی قرائن و شواہد سے حاصل ہو جائے تو ایسے شخص یا ملک کے خلاف جنگ میں پیش قدمی کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ عمل بظاہر تو اقدامی جنگ کہلائے گا، لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ بھی ایک دفاعی جنگ ہے، جس کا نتیجہ اپنے جان و مال اور ملک و ملت کے تحفظ کی صورت میں سامنے آئے گا۔ اس باب کی بعض مثالیں گذشتہ صفحات میں ''عقلی توجیہ'' کے ذیل میں ملاحظہ کیجیے۔

الحاصل! غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بحث محض لفظی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قانون کے دائرے میں اور استطاعت کی شرط کے ساتھ امن و آزادی کے حصول اور ظلم و جبر کے خاتمے کے لیے جدوجہد جاری رکھی جائے۔ یہی عقل کا تقاضا ہے اور یہی اسلام کو مطلوب ہے۔

---

(۱) یہ خطاب جے این یو میں ہوا تھا، جس کے راوی ہمارے رفیق مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی ہیں۔

غلط فہمی کے اسباب

مسئلۂ جہاد کو ان اسلامی مسائل میں سرفہرست رکھا جا سکتا ہے، جن کی تفہیم و تعبیر میں ابہامات ہی نہیں غلط فہمیاں بھی روا رکھی گئی ہیں۔ بدقسمتی سے موجودہ عہد میں جہاد، فساد کے معنی میں بدنام و متعارف ہو گیا ہے۔ ایسے میں یہ سوال بار بار دہرایا جاتا ہے کہ آیا اسلام کا فلسفۂ جنگ امن کا سفیر ہے یا دہشت کا داعی؟ یہ سوال اور بھی اہم ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ عظیم دوم (۱۹۳۹ء-۱۹۴۵ء) کے بعد جنگ کا رخ بطور خاص یورپ سے موڑ کر عالم اسلام کی طرف کر دیا گیا، تب سے اب تک عالم اسلام مسلسل جنگوں کی زد پر ہے۔ اب ایک عام آدمی تو گہرائی سے ان جنگوں کے اسباب و عوامل اور اثرات پر غور نہیں کرتا، ایسے میں اسلام دشمن عناصر کا فریبی ذہن بہ آسانی عوام کو اپنا شکار بنا لیتا ہے اور وہ اس طلسم میں جینے لگتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں ان آتش فشانیوں کا سرا اسلامی فلسفۂ جنگ سے مربوط ہے۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ جہاد کی تفہیم و تعبیر میں جو غلطیاں کی گئی ہیں، یا در آئی ہیں، ان کا ذمہ دار کون ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اس کے ذمہ دار مستشرقین، فرقہ پرست مفکرین اور دیگر متعصبین کے ساتھ خود ہم مسلمان بھی ہیں، بلکہ بطور مسلمان ہمارے سر اس کی ذمہ داری زیادہ آتی ہے، کیوں کہ اس کی درست تفہیم صرف علمی و اخلاقی ہی نہیں، بلکہ ہمارا دینی فریضہ بھی ہے۔ اس سیاق میں دوسرے لوگ تو صرف علمی و اخلاقی سطح پر مجرم ہیں، لیکن ہماری طرف سے اس دینی فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی ہمارے جرم کو اور سنگین کر دیتی ہے۔

یہاں ایک دوسرا سوال یہ ہے کہ تفہیم جہاد میں غلط فہمیوں کے اسباب کیا ہیں؟ اس سلسلے میں چند اہم اسباب درج کیے جاتے ہیں:

۱۔دین کے خلاف ایک لادینی مزاج۔ سیکولرازم اور الحاد کے بڑھتے رجحانات کے تناظر میں جو دانشوری (intellectualism) ظہور پذیر ہوئی ہے، مذہبی تعلیمات اور اخلاقیات میں جراثیم تلاش کرنا اس کا ایک مسلسل ومحبوب مشغلہ بلکہ فریضہ ہے۔ اس قسم کے دانشور مذہب سے ڈرتے رہتے ہیں، یا دوسروں کو ہر وقت ڈراتے رہتے ہیں اور اپنی اخلاق سوز، لامحدود اور بے اصول حریت پسندی کو جواز فراہم کرنے کے لیے مذہبی اور اخلاقی اصولوں کا مذاق اڑاتے رہنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جہاد بھی ان کے تمسخر کا نشانہ بنتا رہا ہے۔

۲۔اسلام کے خلاف تعصّبات۔ استشراق کا وہ گروہ جو علمی لبادے میں مشرقی تہذیبوں خصوصاً اسلام پر تسلط کے لیے کھڑا ہوا، اس نے اپنے الطاف وعنایات سے جہاد کو بھی محروم نہیں رکھا۔ اس کے پیچھے یہ نفسیات بھی کہیں نہ کہیں کارفرما رہی کہ صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد انہیں جنگ کا دوسرا نقشہ مرتب کرنا تھا۔ یہ کام انہوں نے لوح وقلم کے ذریعے علم وتحقیق کے نام پر کیا۔ اس کے لیے سب سے آسان راستہ یہ تھا کہ اسلام کو ایک جنگ جو اور خونخوار مذہب بنا کر پیش کر دیا جائے۔ برصغیر کی اسلام دشمن تنظیموں اور متعصب مفکرین کو بھی اسی زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔

۳۔آیات جہاد کی خلافِ سیاق تفہیم۔ اس قسم کے متعصبین کے استدلال کی جو سب سے بڑی کمزوری ہے، وہ آیات جہاد کو ان کے سیاق سے ہٹا کر دیکھنا ہے۔ فہم نص کے حوالے سے یہ ایک عام اصول ہے کہ اگر آپ کسی بھی نص (text) کو اس کے سیاق (context) سے ہٹا کر دیکھیں گے تو اس کا مفہوم گڈمڈ ہو جائے گا۔ بدقسمتی سے اس جرم کا ارتکاب متعصب گروہوں نے بہت ہی چابک دستی سے کیا ہے۔ اس لیے آیات جہاد کی خلاف سیاق تفہیم کو بھی اس حوالے سے پیدا غلط فہمیوں کی ایک بڑی وجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

آیات قرآن کو ان کے سیاق میں سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ان آیات کے نزول کے عہد اور ان کے پس منظر کو سمجھا جائے، مختلف آیات قرآنیہ کو ایک دوسرے سے مربوط کیا جائے، سیرت رسول اکرم ﷺ سے ان کی عملی تطبیق کو سامنے رکھا جائے، نیز عربی زبان اور قواعد پر نظر رکھی جائے، اس کے بعد ہی آیات جہاد یا دیگر آیات قرآنیہ کی درست تفہیم ممکن ہو سکے گی۔

۴-عالم اسلام کا میدان جنگ بن جانا۔گذشتہ پوری صدی کا مطالعہ کیجیے تو عالم اسلام جنگ کے شعلوں میں جلتا ہوا نظر آئے گا۔اس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔اس کی وجہ سے بھی اس فکر کو ہوا ملی کہ اسلام کا جہادی نظام ُجنگ جو یانہ نظام ٗ ہے۔یہاں تک کہ کوئی دوسرا نہ ملے تو مسلمان خود آپس میں بھی لڑتے رہتے ہیں۔حالاں کہ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ عالم اسلام کا شعلوں میں جلنا، کسی ایک سبب سے نہیں ہے، بلکہ اس کے متعدد اسباب ہیں۔مثلاً:

الف-اٹھارہویں اور انیسویں صدی استعمار کی صدی تھی۔اس نے پوری دنیا کو غلام بنا رکھا تھا۔مسلمانوں کے ادارۂ خلافت کے سقوط میں بھی اس کا بڑا دخل تھا۔انیسویں صدی میں پوری دنیا میں ان غاصبین کے خلاف تحریک آزادی شروع ہوئی،جس سے ہمارا ملک بھارت بھی مستثنیٰ نہیں رہا۔عالم اسلام نے بھی اس کے لیے طویل جنگیں لڑیں۔

ب-جس طرح استعمار نے اپنے تسلط کے لیے *divide and rule* (تقسیم کرو اور حکومت کرو) کو ہتھیار بنایا، اسی طرح اپنی بساط سمیٹنے کے بعد بھی اہل وطن کو اس مکر کے ذریعے مختلف قسم کی جنگوں میں ڈال دیا۔کشمیر اور فلسطین کی مثالیں سرفہرست ہیں۔لیکن دوسری مثالیں بھی ان سے کم اہم نہیں ہیں۔خصوصاً عالم عرب کی ٹکڑیوں میں تقسیم اور ان کے بیچ سیاسی رقابتیں پیدا کر کے انہیں مستقل باہم دست وگریبان رکھنا اور اس طرح سے غلامی کے بعد بھی انہیں غلام بنائے رکھنے کی پالیسی ، ایک مستقل بیرونی سیاسی سازش ہے،اس کا تعلق اہل عرب کے مذہب یا فلسفۂ جہاد سے نہیں ہے۔

ج-مشرق وسطیٰ جہاں گذشتہ صدی پیٹرول کی بازیافت ہوئی اور جو مغربی مصنوعات کی کھپت کے لیے ایک اچھا بازار تھا،اس کے مختلف ملکوں کو کسی بھی طرح سے الجھا کے رکھنا بیرونی طاقتوں کے لیے ضروری تھا،تاکہ وہاں بیرونی طاقتیں قیام عدل وانصاف کے نام پر بندر بانٹ کا کھیل جاری رکھ سکیں۔الغرض عالم اسلام کا معاشی استحصال بھی وہاں برپا جنگوں کے لیے ایک بڑا محرک رہا ہے۔

د-دوسری طرف عالم اسلام میں استعماری مکر اور اقتصادی فریب کے خلاف شدید نفرت پیدا ہونے لگی۔اس بڑھتی ہوئی نفرت نے اپنے اظہار کے لیے ادارۂ خلافت کی بازیابی اور الجہاد کا نعرہ بلند کیا۔القاعدہ اور داعش جیسی مغلوب الغضب قوتوں نے اسلامی

جہاد کی وہ تفسیر کی جو خوارج کی تفسیر سے قریب تر ہے۔ ان ہیجانی عناصر کے مغلوب الغضب فکر و کردار نے اب تک نہ تو ادارۂ خلافت کا احیا کیا اور نہ ہی عالم اسلام کو مغربی یلغار اور اقتصادی استحصال سے آزادی دلائی، البتہ فلسفۂ جہاد کی بدنامی اور مسلمانوں کے بیچ تکفیریت کے فروغ اور کشت و خون کے شرمناک مناظر ضرور پیش کیے۔ یہ مسئلہ ہنوز مسئلہ ہی ہے!

۵۔ بعض علماے اسلام کی تعبیرات جہاد۔ اس سلسلے میں بعض علماے اسلام کی تعریفات جہاد نے بھی کم کردار ادا نہیں کیا۔ مثال کے طور پر معروف حنفی فقیہ علامہ علاء الدین حصکفی (۱۰۸۸ھ) لکھتے ہیں:

الدُّعَاءُ إِلَى الدِّينِ الْحَقِّ وَقِتَالُ مَنْ لَمْ يَقْبَلْهُ. (۱)

دین حق کی دعوت دینے اور جو اسے قبول نہ کرے اس سے لڑنے کا نام جہاد ہے۔

بعض علماے اسلام کی طرف سے کی جانے والی جہاد کی اس قسم کی روایتی تعبیرات ہی ایسی ہیں، جن سے اسلام کی ایک خونخوار شبیہ سامنے آتی ہے۔ ان کے بجائے ایک دوسرے حنفی فقیہ جو انہی کے ہم نام، مگر ان سے پانچ سو سال پہلے کے ہیں، علامہ علاء الدین کاسانی حنفی (۵۸۷ھ) لکھتے ہیں:

بَذْلُ الْوُسْعِ وَالطَّاقَةِ بِالْقِتَالِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ - عَزَّ وَجَلَّ - بِالنَّفْسِ وَالْمَالِ وَاللِّسَانِ، أَوْ غَيْرِ ذَلِكَ. (۲)

جہاد یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جان، مال، لسان اور دیگر طریقوں سے جنگ کرتے ہوئے اپنی پوری طاقت صرف کردی جائے۔

عام علماے اسلام نے جہاد کی تعریف کے لیے اسی طرح سے ''قتال فی سبیل اللہ'' کی مختصر مگر جامع تعبیر استعمال کی ہے، جس کی طرف کہیں نہ کہیں کتاب وسنت میں اشارات موجود ہیں۔ اس کے برخلاف اول الذکر تعبیر مخصوص سیاسی ومعاشرتی عہد کے مخصوص ذہن کی پیداوار ہے۔ راست طور پر کتاب وسنت سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی یہ رائے بھی بہت حد تک قابل غور ہے:

---

(۱) الدر المختار، کتاب الجہاد

(۲) بدائع الصنائع، کتاب السیر

''[جہاد کے تعلق سے] کچھ غلط فہمی اس لئے بھی پیدا ہوتی ہے کہ فقہاء نے اپنے اجتہاد سے جو احکام بیان کئے ہیں، وہ زیادہ تر اس عہد کے حالات پر مبنی ہیں، جس دور میں ہماری فقہی کتابیں مرتب کی گئیں۔ اس دور میں کوئی ایسا عالمی ادارہ نہیں تھا، جو تمام ملکوں کو کسی معاہدہ کا حصہ بناتا اور سبھوں سے اس بات کی ضمانت لیتا کہ وہ ایک دوسرے کی سرحدوں میں مداخلت نہیں کریں گے اور ہر ملک دوسرے ملک کے اقتدار اعلیٰ کا احترام کرے گا۔'' (جہاد کیا ہے؟، پیش لفظ، ص: ۲۰)

مگر افسوس اس کا ہے کہ اس بدلے ہوئے عہد میں جب ممالک دار الحرب اور دار الاسلام کی متعینہ تحدید سے نکل چکے ہیں (۱)، اب بھی بعض حضرات آنکھ بند کر کے اسی قسم کی تعریفات اپنی کتابوں میں لکھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ حضرات کہیں نہ کہیں مقاصد شرع اور احوال زمانہ سے چشم پوشی کے مرتکب ہیں۔ (۲)

اس کے برعکس علامہ کاسانی حنفی کی تعریف۔ جو اوپر مذکور ہوئی اور بالعموم متقدمین نے بھی اسی انداز میں جہاد کی تعریف کی ہے۔ بہت حد تک جامع ہے۔ اس کے اجمال میں جہاد کے وہ تمام شرائط و آداب شامل ہیں، جن کو فقہاے اسلام نے تفصیل سے لکھا ہے۔ اس میں یہ نہیں ہے کہ جو اسلام قبول نہ کرے اس سے جنگ کرنا جہاد ہے، بلکہ اس میں اللہ کی راہ میں جنگ کرنے کو جہاد کہا گیا ہے، خواہ وہ اپنے وجود کے ذریعے ہو، زبان کے ذریعے ہو یا کسی اور ذریعے سے ہو۔ ظاہر ہے کہ زبان سے کسی کی گردن نہیں کاٹی جاتی، بلکہ کسی کے شبہات کا علمی جواب دیا جاتا ہے، لہٰذا اس تعریف سے معلوم ہوا کہ علمی استدلال بھی جہاد کے خانے میں شامل ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فی سبیل اللہ سے مراد صرف جنگ نہیں ہے، بلکہ اظہار حق و انصاف اور دفاع ظلم و جور کے لیے جو قدم بھی اٹھایا جائے، وہ فی سبیل اللہ کا حصہ ہے۔ مزید وضاحت ''مفہوم جہاد'' اور ''اقسام جہاد'' کے ذیل میں گزر چکی۔

---

(۱) یہ ایک تفصیل طلب بحث ہے۔ مختصر یہ کہ دار الحرب اور دار الاسلام کے علاوہ ایک تیسری صورت بھی ہے۔ ماضی میں اس کی مثال دار المعاہدہ کی تھی، گو کہ اس کی مثالیں کم تھیں، اب اس کی مثال میں دار الجمہوریہ کا بہ کثرت وجود ہے۔

(۲) مثلاً مولانا جمیل احمد سکروڈوی (۱۹۴۶-۲۰۱۹ء) سابق استاذ دار العلوم دیوبند کی تعریف جہاد جو پچھلے دنوں میڈیا میں زیر بحث رہی۔ دیکھیے: (اشرف الہدایہ، جلد: ۷، صفحہ اول)

آیات جہاد کی ان تفاسیر کو بھی اسی ذیل میں رکھا جائے گا جن کے اندر بہت سے مفسرین نے آیات قتال اور آیات سلام میں تطبیق کے بجائے، آیات سلام کی تنسیخ فرما دی ہے۔

المختصر! فلسفۂ جہاد کے گرد شکوک وشبہات پیدا کرنے والے یہ چند اہم اسباب ہیں۔

اسلام۔ایک پرامن دعوتی مذہب

اسلام ایک پر امن دعوتی مذہب ہے اور اس دعوت کی بنیاد جنگ نہیں، تفہیم واستدلال ہے۔اللہ پاک کاارشاد ہے:

ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ. (النحل:۱۲۵)

اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اوراچھی نصیحت کے ذریعے دعوت دواور دوسروں سے احسن طریقے سے مکالمہ کرو۔

شیخ الازہر علامہ محمود شلتوت (۱۹۶۳ء) نے اس کی توجیہ کچھ اس طرح فرمائی ہے:

الف۔اسلام کافلسفۂ دین انتہائی واضح اور سہل ہے۔اس میں کوئی فکری غموض اور پیچیدگی کی گنجائش ہی نہیں ہے۔لہٰذا اس کی دعوت میں اصلاً جبرو اِکراہ اور قوت وجنگ کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے۔(۱)

ب۔اسلام کی فطرت، کائنات کی فطرت سے ہم آہنگ ہے۔نہ کائنات کی فطرت میں تضاد ہےاور نہ اسلام کی فطرت میں تضاد ہے۔جس طرح کائنات میں انسان ایک صاحب اختیار مخلوق ہےاور وہ اس میں عقل وفہم کے مطابق تصرف کرتا ہے، اسی طرح ایمان وکفر کے معاملے میں اسلام نے اسے صاحب اختیار رکھا ہےاور اُسے اس کے لیے تدبر وتفکر کواستعمال کرنے کی دعوت دی ہے۔

---

(۱) الدِّینُ یُسْرٌ (بخاری، ح: ۳۹)/لااکراہ فی الدین (البقرۃ:۲۵۶)

ج۔قرآن کے واضح نصوص دین کے معاملے میں کسی بھی طرح کے جبر واِکراہ کے خلاف ہیں۔

د۔داعی اسلام سے کل صرف یہ سوال ہونا ہے کہ اس نے اپنی ذمہ داری پوری کی یا نہیں، اس سے یہ سوال نہیں ہونا ہے کہ لوگ مسلمان ہوئے یا نہیں۔اس لیے اُسے جبر واِکراہ کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے۔(۱)

ھ۔اسلامی دعوت کا اولین مصدر قرآن ہے، وہ اکراہ اور مجبوری میں قبول کیے گئے اسلام کو سرے سے اسلام ہی تسلیم نہیں کرتا، ایسے میں اسلامی دعوت میں جبر واِکراہ کا تصور ہی عبث اور فضول ہے۔(۲)

اسلام کا پرامن دعوتی مزاج اُن قرآنی اصولوں سے بھی واضح ہے، جو مختلف آیات میں بیان کیے گئے ہیں۔ان میں سے چند اصول یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

پہلا اصول-حفاظت جان

روئے زمین پر قیام امن کے لیے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ انسانوں کی جانیں محفوظ رہیں۔جان ہی محفوظ نہ ہوتو پھر امان کس پرندے کا نام ہوگا؟ بقول جگر مرادآبادی:

ہمیں گر نہ ہوں گے تو کیا رنگ محفل
کسے دیکھ کر آپ شرمایئے گا

اسلام نے جان کی حفاظت پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔اس حوالے سے قرآن کی وہ تعلیم بہت ہی اہم ہے جس میں ناحق ایک جان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل اور ایک جان کی حفاظت کو پوری انسانیت کی حفاظت کہا گیا ہے۔اس حکمِ عام میں مسلم وغیر مسلم سب شامل ہیں۔اللہ کریم کا ارشاد ہے:

مَن قَتَلَ نَفسًا بِغَيرِ نَفسٍ أَو فَسَادٍ فِي ٱلأَرضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ ٱلنَّاسَ جَمِيعًا وَمَن أَحيَاهَا فَكَأَنَّمَآ أَحيَا ٱلنَّاسَ جَمِيعًا (المائدۃ:۳۲)

---

(۱) لَّستَ عَلَيهِم بِمُصَيطِرٍ (الغاشیۃ:۲۲)

(۲) القرآن والقتال، ص:۳۳، ۳۴، ملخصاً، قاہرہ، ۲۰۱۷ء

قصاص یا فساد فی الارض کے علاوہ کسی نے اگر ایک جان کو بھی قتل کیا تو گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا اور کسی نے اگر ایک جان بچادی تو گویا اس نے پوری انسانیت کو بچادیا۔

جان کی حفاظت انسانیت کا سب سے بنیادی مسئلہ ہے۔ اس لیے اس کو یقینی بنانے کے لیے سخت منصفانہ قانونی نظام قائم کیا۔ یہ نظام قصاص کا نظام ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيكُمُ القِصَاصُ فِي القَتلَى (البقرة:۱۷۸)

اے ایمان والو! مقتولین کے معاملے میں تم پر قصاص فرض کیا گیا۔

یہ الگ بات ہے کہ مظلوم کو خصوصی طور پر یہ حق دیا گیا کہ وہ چاہے تو اپنی طرف سے قاتل کو۔ بعوض یا بلاعوض۔ معاف کر دے۔ چوں کہ اسلام میں بدلہ لینا مظلوم کا قانونی حق ہے اور معاف کرنا اس کا ذاتی اختیار ہے، جو حق تعالیٰ کو پسند ہے۔

دوسرا اصول۔ تصور مساوات

روئے زمین پر قیام امن کے لیے بنیادی چیز یہ ہے کہ انسانوں کے بیچ کسی طرح کی تفریق نہ کی جائے۔ سب کو برابر حق اور مقام دیا جائے۔ یہ کام تصور مساوات سے ہوسکتا ہے۔ اسلام نے تصور مساوات کو بہت واضح کیا ہے۔ اس کے لیے اسلام نے وحدت الٰہ اور وحدت آدم کا نظریہ پیش کیا ہے۔ اللہ پاک کا ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (النساء:۱)

اے لوگو! اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا۔ اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا، پھر ان دونوں کے توسط سے بہت سے مرد و عورت پیدا کر ڈالے۔

ایک خالق اور ایک باپ تسلیم کر لینے کے بعد اب نہ تو روحانی سطح پر کوئی تفریق رہی اور نہ جسمانی سطح پر کوئی امتیاز رہا۔ جب خدا سب کا ایک ہے اور نسل سب کی ایک ہے، پھر انسانی سطح پر کسی طرح کا کوئی فرق و امتیاز نہیں رہا۔ ذات پات اور رنگ و نسل کا کوئی عنوان

انسانوں کے بیچ کسی تفریق (*discrimination*) کا سبب نہیں بن سکتا۔ دنیا کے بہت سے مذہبی اور معاشرتی افکار آج بھی ہیں جو نسلی تفاخر اور رنگ و نسل کے فرق سے انسانوں کے بیچ انسانی اور عقلی فرق کے قائل ہیں۔ دوسری قوموں کے ساتھ صحبت ومعاشرت کے سبب یہ خیالات بعض دفعہ مسلمانوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اسلام ان تمام تفریقات کو مٹا کر حقیقی مساوات قائم کرتا ہے، جو امن وسلام اور محبت وسکون کے قیام کے لیے ضروری ہے۔

اسلام کی نظر میں انسانوں کے بیچ برتری کے معیار صرف دو ہیں؛ علم اور تقویٰ، جن کا دروازہ ہر رنگ و نسل کے ہر فرد کے لیے کھلا ہوا ہے۔

سورۂ حجرات میں ہے:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات: ۱۳)

اے انسانو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہیں مختلف کنبوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا، تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ ہے جو سب سے بڑا متقی ہو۔

اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ، أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ، وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ، وَلَا أَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ، وَلَا أَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ، إِلَّا بِالتَّقْوَى (مسند احمد، ح:۲۳۴۸۹)

اے لوگو! یاد رکھو کہ تمہارا رب ایک ہے، تمہارے باپ ایک ہیں، خبر دار! کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی سرخ کو کسی کالے پر، یا کسی کالے کو کسی سرخ پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اگر کوئی فضیلت ہے تو اس کی بنیاد تقویٰ ہے۔

ایک ضعیف حدیث اس معنی کی مزید وضاحت کرتی ہے:

النَّاسُ سواءٌ كأسنانِ المُشطِ. (کنزالعمال: ۲۴۸۲۲)

سارے انسان کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر ہیں۔

تیسرا اصول۔آزادیٔ فکرومذہب

فکرونظر اور مذہب وملت کی آزادی انسان کا ایک بنیادی حق ہے۔ یہ نہ ہوتو زندگی اور مساوات کے الفاظ بے معنی ہوجائیں۔اس تصور سے انسان بہت بعد میں واقف ہوا۔ مذہب کے نام پر تشدد سے تاریخ بھری پڑی ہے۔اس میں شک نہیں کہ بہت سی حکومتوں اور مختلف مذہبی روایتوں میں مذہبی رواداری بھی نظر آتی ہے۔لیکن معلوم انسانی تاریخ میں سب سے پہلے اسلام نے مذہبی آزادی کو انسان کے ایک بنیادی حق کے طور پر تسلیم کیا اور اس حوالے سے یہ واضح اصول(crystal clear principle)دیا:

لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (البقرة:۲۵۶)

دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔

جس عہد میں ہم جی رہے ہیں، اس میں یہ آواز کوئی حیرت انگیز نہیں ہے۔ اقوام متحدہ نے ۱۹۴۸ء میں (Universal Declaration of Human Rights, Article 18) کے تحت یہ اعلان کیا:

''ہر انسان کو آزادیٔ فکر، آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے اور پبلک میں یا نجی طور پر، تنہا یا دوسروں کے ساتھ مِل جل کر عقیدے کی تبلیغ، عمل، عبادت اور مذہبی رسمیں پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔''(انسانی حقوق کا عالمی منشور، دفعہ:۱۸)

یہ بات بیسویں صدی کی ہے، لیکن ساتویں صدی میں یہ بات کہیں اس سے بھی زیادہ وضاحت اور دوٹوک لفظوں میں کہی گئی تو وہ عرب کی سرزمین تھی۔قرآن کا تیور دیکھیے:

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا (الکھف:۲۹)

کہہ دو! حق تمہارے رب کی جانب سے ہے۔ اب جو چاہے ایمان لائے، جو چاہے نہ لائے۔ البتہ ہم نے ظالموں کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے۔

اس میں اسلام کی صداقت کا جس بلند آہنگی کے ساتھ اعلان کیا گیا ہے، اسی انداز سے مذہب کے معاملے میں انسان کی فکروضمیر اور دین ومذہب کی آزادی کا بھی بیان کیا گیا ہے۔

چوتھا اصول۔ صلح عامہ کا تصور

آزادی فکر حاصل ہو، لیکن اظہار رائے کے وقت اگر اختلاف رائے پیدا ہو جائے اور اس وقت انسان وحشی بن جائے تو امن وسکون شدید خطرات سے دو چار ہو جائے گا۔ اسی لیے اختلاف رائے کے ساتھ ادب اختلاف کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ قرآن میں ہے:

ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النحل: ۱۲۵)

اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے دعوت دو اور دوسروں سے احسن طریقے سے مکالمہ کرو۔

حضرات موسیٰ وہارون علیہما السلام کو حکم ہوا:

اِذهَبَآ إِلَىٰ فِرعَونَ إِنَّهُ طَغَىٰ فَقُولَا لَهُ قَولا لَّيِّنا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَو يَخشَىٰ (طٰہٰ: ۴۳، ۴۴)

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، جو سرکشی پر آمادہ ہے اور اس سے نرمی سے بات کرو، شاید وہ نصیحت پکڑے یا اس میں ڈر پیدا ہو۔

فرعون جیسے سرکش کے ساتھ حضرت موسیٰ جیسے جلیل القدر پیغمبر کو نرم لہجہ اختیار کرنے کا حکم ہوا۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ حتی الامکان صلح وآشتی قائم رہے۔

اگر نرمی اور محبت کے بعد بھی کوئی بدتمیزی وبیہودگی پر آمادہ ہو جائے تو اس کے ساتھ عفوودرگذر، اعراض اور ترک کلام کا حکم ہے۔ ارشاد ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ (اعراف: ۱۹۹)

معاف کرو، اچھے سے اپنی بات رکھو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔

لیکن بات اگر صرف لفظی بیہودگی تک نہ رکے، بلکہ مخاطب جنگ وجدل پر آمادہ ہو تو ایسی صورت میں آخری حد تک صلح وآشتی کی کوشش کرنی چاہیے۔ ارشاد ہے:

وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (النساء: ۱۲۸) صلح اچھی چیز ہے۔

آخری حد تک بحث، جدال اور جنگ سے اعراض اور صلح کی تلاش سے اسلامی امن پسندی کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

پانچواں اصول۔عدل عامہ کا تصور

ہاں! اگر صلح وآشتی کی ہر کوشش بھی ناکام ہوجائے تو ایسی صورت میں جنگ وانتقام ضروری ہوجاتا ہے۔اب جب انسان انتقام کے لیے کھڑا ہوتا ہے اوراس کے پاس طاقت وقوت بھی ہوتو اس وقت اس کا اصل امتحان شروع ہوتا ہے۔قیام امن کے لیے ضروری ہے کہ جب اہل اقتدار انتقام کے لیے کھڑے ہوں تو عدل وانصاف قائم کریں، ظالموں کے خلاف خود ان سے بڑے ظالم نہ بن جائیں۔اس تعلق سے اسلام کی تعلیمات بہت ہی واضح اور دوٹوک ہیں۔وہ بہرصورت عدل وانصاف چاہتا ہے۔یہ ارشاد دیکھیے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (المائدۃ:۸)

اے ایمان والو! اللہ کے لیے عدل قائم کرنے والے بن جاؤ، کسی قوم کا ظلم کہیں تمھیں مجرم نہ بنادے کہ تم خود ظلم کرنے لگو۔عدل کرو، یہی تقوے سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک وہ تمہارے کرتوتوں سے باخبر ہے۔

قیام امن کی جب کوئی صورت نہ بچے اور جنگ مجبوری بن جائے، وہاں جنگ کی جائے گی، بے خوف وخطر کی جائے گی، لیکن اسلامی اصولوں کے مطابق کی جائے گی، ظالموں سے انتقام لیا جائے گا، لیکن اس انتقام میں بھی انصاف کا دامن تھامے رہنا ہوگا، کیوں کہ اسلامی فلسفۂ جنگ میں پیدا شدہ ظلم وفساد کا خاتمہ مقصود ہے، کسی نئے ظلم وفساد کا آغاز نہیں۔قیام عدل کے سیاق میں مذکورہ بالا آیت کے اندر یہی حقیقت بیان کی گئی ہے۔یہی حقیقت خاص جنگ کے سیاق میں بھی بیان کی گئی ہے۔ارشاد ہے:

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ﴿۱۹۰﴾ جو لوگ تم سے جنگ کریں، ان سے اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور حد سے نہ بڑھو، بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

قیام امن وانصاف کے حوالے سے ان اسلامی اصولوں کا غیر معمولی کردار ہے۔

❀❀❀

تلاش امن۔ دعوت سے جہاد تک

اسلام کی ترجیح جنگ نہیں، امن ہے۔ جنگ، صرف ناگزیر صورت حال میں قیام امن کے لیے روا رکھی گئی ہے، جس کی ہر دور میں انسانوں کے ساتھ چرند و پرند کو بھی ضرورت رہی ہے اور رہتی دنیا تک رہے گی، کیوں کہ بدامنی کی صورت میں دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہوجائے گا۔ سچ پوچھیے تو اسلام میں جنگ بھی دراصل امن کی ہی تلاش ہے۔ آج بھی دنیا کے سارے ممالک اپنے بجٹ کا بڑا حصہ اپنے داخلی اور خارجی امن کے لیے اپنی فوج پر خرچ کرتے ہیں، جو فوج وزارت دفاع (Ministry of Defence) کے تحت اپنا کام کرتی ہے۔ تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کے سارے ممالک جنگ جو اور فساد پسند ہیں؟ ایسا ہرگز نہیں! بلکہ سب کے سب اپنی جنگ کی تیاری اس لیے رکھتے ہیں تاکہ وہ اپنے شہریوں کو امن وسکون فراہم کرسکیں۔ عہد اول میں مسلمانوں نے بھی اسی طرح اپنے اور دوسرے مظلوموں کے دفاع اور تحفظ کے لیے رفتہ رفتہ دعوت ومحبت سے جنگ و جہاد تک کا سفر طے کیا۔ درج ذیل مقدمات سے اسلام کے امن پسندانہ مزاج اور اس کے تصور جنگ کا نقشہ سامنے آتا ہے:

۱۔ اسلام لفظ ہی ایسا ہے جس کی ساخت اور معنی میں امن وسلام (peace and security) پوشیدہ ہے۔ اب جس مذہب کے لفظ و معنی ہی امن وسلام ہوں، اس میں بھلا تشدد یا دہشت گردی کی گنجائش کہاں ہوسکتی ہے!

۲۔ امن وسلام نہ صرف اسلام کے لفظ و معنی میں شامل ہے، بلکہ قرآن کے مطابق خود اللہ تعالیٰ کے نام میں بھی امن وسلام شامل ہے، چنانچہ قرآن نے حق تعالیٰ کے اسما میں السلام

(The granter of security) اور المؤمن (The Peace)
کو بھی شامل کیا ہے۔(الحشر:۲۳) دین اسلام قبول کرنے والے کے نام بھی یہی مسلم ومومن
ہیں۔اسی طرح جنت کا ایک نام دارالسلام (The House of Peace) ہے
اور مسجد حرام ومسجد نبوی کے دروازوں میں سے ایک دروازہ باب السلام (The gate
of Peace) ہے۔دنیا میں اہل اسلام ایک دوسرے سے ملتے وقت السلام علیکم
(Peace be upon you) کہتے ہیں اور یہی طریقہ اہل جنت کا بھی
ہوگا۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام میں امن وسلام پر کتنا زور ہے اور جس مذہب میں
امن وسلام پر اتنا زور ہو، بھلا اس میں تشدد اور دہشت گردی کی گنجائش کیوں کر ہو سکتی ہے!

۳۔قرآن پاک میں سب سے پہلا اللہ کا جو وصف سامنے آتا ہے، وہ الرَّحمٰن
(The all-Compassionate) ہے، جس کے معنی ہیں بلا تفریق
سب پر رحم کرنے والا۔اسی طرح قرآن کی پہلی سورہ 'الفاتحہ' میں اللہ پاک کا پہلا وصف
ربُّ العالمین (The Lord of all worlds) ہے، جس کے معنی
ہیں بلا استثنا سارے عالم کا پروردگار۔اسی طرح قرآن میں آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رحمۃ للعالمین (Mercy for all worlds) بلا استثنا
سارے عالم کے لیے رحمت کہا گیا ہے۔جس دین میں رحمت، تربیت اور محبت اس قدر عام
ہو، اس میں بلا ضرورت جنگ وجدل اور نفرت وتشدد کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے؟

۴۔جنگ کو عربی میں حرب کہتے ہیں، قرآن میں یہ فقط چار مقامات پر وارد ہے۔
اس کے برعکس امن (security) پانچ بار اور سلام (peace) ۴۲ مقامات پر
وارد ہیں۔اس سے جنگ وامن کے بارے میں اسلام کا اجمالی تصور ابھرتا ہے۔

۵۔اخلاقیات عامہ میں اسلام نے کہیں بھی کفر واسلام کا امتیاز نہیں رکھا ہے۔مثال
کے طور پر والدین کے حقوق، پڑوسی کے حقوق، بڑوں کے حقوق، چھوٹوں کے حقوق اور
غریبوں اور یتیموں کے حقوق جہاں بھی اسلام نے بیان کیے ہیں، انہیں اسلام یا مسلمان کی
قید سے آزاد رکھا ہے۔اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ رسول اکرم
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سلوک ہمیشہ ہمدردانہ اور محبتانہ تھا، جنگ جویانہ یا متعصّبانہ نہیں تھا۔

۶۔پیغمبر اسلام اپنی پوری زندگی مظلوم رہے ظالم نہیں رہے، مکہ میں انہیں اور دیگر مسلمانوں کو مسلمان ہونے کی وجہ سے ستایا گیا، وہ صرف اپنی باتیں سنانا چاہتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ جو ماننا چاہیں وہ مانیں، لیکن ان کے سنانے پر بھی تشدد کیا گیا اور اگر کسی طرح کچھ لوگوں تک آپ کی باتیں پہنچیں اور انہوں نے وہ باتیں قبول کر لیں تو ان ماننے والوں کے ماننے پر بھی تشدد کیا گیا، انہوں نے اہل طائف اور دیگر قبائل کو پُرامن دعوت دی، جس کی پاداش میں آپ پر ظلم وتشدد کیا گیا، زیادتیاں کی گئیں، لیکن ان زیادتیوں کے بعد بھی آپ نے ان کی تباہی اور ہلاکت کی دعا نہیں کی، بلکہ ان کے اور ان کی آنے والی نسلوں کی ہدایت کی دعا کی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور کا سینہ پوری انسانیت کے لیے کس قدر محبت، سلامتی اور ہدایت کے جذبات سے لبریز تھا۔ اس عہد میں آپ کو اور آپ کے اصحاب کو مسلسل صبر وضبط اور عفو ودر گذر کی تلقین کی جاتی رہی۔ جیسے یہ ارشاد:

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ [الروم ۶۰]

صبر کرو، بے شک اللہ کا وعدہ حق ہے۔ لہٰذا غیر مومن تمہیں ہرگز ہلکے میں نہ لیں۔

۷۔توحید (एकेश्वरवाद) کی پُرامن دعوت کی پاداش میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب پر زندگی کا حصار تنگ کر دیا گیا، یہاں تک کہ آپ کو اپنے اصحاب کو پہلے حبشہ (Ethiopia) اور پھر مدینہ ہجرت کرنے کی اجازت دینی پڑی۔ یہ ہجرت کا سفر بھی دراصل امن کی تلاش کا ایک سفر تھا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو حبشہ روانہ کرتے وقت فرمایا تھا:

لَوْ خَرَجْتُمْ إِلَى أَرْضِ الْحَبَشَةِ فَإِنَّ بِهَا مَلِكًا لَا يُظْلَمُ عِنْدَهُ أَحَدٌ. (۱)

بہتر ہوتا کہ تم لوگ سرزمین حبشہ کی طرف نکل جاتے، جہاں ایک ایسا بادشاہ ہے کہ جس کے حضور کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔

آپ کے اصحاب، حبشہ کے مسیحی حکمراں نجاشی کے پاس گئے، نجاشی ان کی باتیں سن کر متاثر ہوا اور انہیں اپنی زمین پر پناہ دے دی اور اس طرح مسلمانوں اور مسیحیوں کے بیچ اچھے تعلقات قائم ہو گئے۔

---

(۱) سیرۃ ابن ھشام، ذِكْرُ الْهِجْرَةِ الْأُولَى إِلَى أَرْضِ الْحَبَشَةِ

دشمن آپ ﷺ کے قتل کے درپے تھے، اس لیے بالآخر آپ کو بھی وطن عزیز مکہ چھوڑنا پڑا۔ آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور ہجرت مدینہ کے بعد مدینہ میں پہلی بین المذاہب جمہوری ریاست قائم کی اور اہل مدینہ نے آپ کو اس ریاست کا سربراہ مقرر کیا۔ عملی اعتبار سے یہ پہلی جمہوری وفاقی ریاست تھی، جس میں مذہب جبری نہیں تھا، بلکہ مذہب کے معاملے میں سب آزاد تھے، البتہ فوج داری قانون (criminal law) ایک تھا۔ ریاست مدینہ کی حفاظت تمام شہریوں کی مشترکہ ذمہ داری تھی اور اندرون خانہ کسی جرم کی سزا مجرم کے پورے قبیلے کے بجائے صرف اس مجرم کو ہی دی جاتی تھی، جس میں فیصل حضور اکرم ﷺ تھے اور معاون سارے مسلم و غیر مسلم قبائل تھے۔ میثاق مدینہ روئے زمین کا پہلا تحریری منشور اور ریاست مدینہ پہلی جمہوری ریاست تھی، جس کے اپنے خصائص و امتیازات تھے۔ اگر اسلام بہر صورت مذہب کی بنیاد پر ریاست کی تشکیل کی بات کرتا تو ریاست مدینہ کی تشکیل نہ ہوتی۔

۸۔ ہجرت مدینہ کے بعد اب امید تھی کہ اہل ایمان کھلی فضا میں سانس لیں گے اور محبت اور حریت کے ساتھ دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیں گے، لیکن یہاں وہ چوطرفہ سازشوں کا شکار ہو گئے۔ اہل مکہ نے مکہ میں رہ گئے مسلمانوں اور ان کی املاک پر تشدد کیا، نیز پہلے کوشش کی کہ ان کے دباؤ میں اہل مدینہ ان نئے مہاجرین کو مدینے سے نکال دیں۔ چنانچہ اہل مکہ نے مشرکین مدینہ کو یہ خط لکھا:

> ”تم لوگوں نے ہمارے آدمی کو اپنے یہاں پناہ دے رکھی ہے۔ ہم اللہ کی قسم کھاتے ہیں، یا تو تم اس سے جنگ کرو یا اپنے شہر سے نکال باہر کرو، بصورت دیگر ہم اپنی پوری جمعیت کے ساتھ تمہاری طرف آئیں گے، تمہارے جنگ جوؤں کو قتل کر دیں گے اور عورتوں کو اپنے لیے حلال کر لیں گے۔“

جب یہ پیغام عبد اللہ بن ابی اور دیگر مشرکین مدینہ تک پہنچا تو وہ سب رسول خدا ﷺ اور ان کے اعوان و انصار کے خلاف جنگ کرنے کے ارادے سے جمع ہو گئے۔ جب یہ خبر حضور پاک ﷺ کو پہنچی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جا کر ان سے ملاقات کی اور ارشاد فرمایا:

''قریش کی دھمکی اپنی انتہا تک پہنچ چکی ہے۔لیکن قریش تمہیں اتنا ضرر نہیں پہنچا سکتے جتنا تم خود کو ضرر پہنچانے کے درپے ہو۔ کیوں کہ تم اپنے ہی بیٹوں اور بھائیوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو۔''

یہ سن کر مشرکین مدینہ کا جتھہ منتشر ہو گیا۔(۱)

۹۔اہل مکہ نے اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ جو زائرین حرم مدینہ سے مکہ آتے، انہیں بھی طرح طرح سے دھمکانے اور اذیت پہنچانے کی کوشش کی۔ چنانچہ بخاری کی ایک روایت ہے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ عمرہ کی نیت سے مکہ آئے۔ امیہ بن خلف آپ کا دوست تھا جو شام کی طرف تجارت وغیرہ کے لیے جب مدینہ سے گزرتا تو حضرت سعد کے یہاں قیام کیا کرتا تھا۔حضرت سعد نے بھی اس سفر میں اس کے مہمان ہوئے۔ اب امیہ کے سامنے دو باتیں تھیں، ایک اپنے پرانے محسن کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور دوسرا اہل مدینہ کے خلاف بھڑکے ہوئے مکی سرداروں سے ان کی حفاظت کرنا۔اس لیے امیہ نے یہ تجویز رکھی کہ جب دوپہر کا وقت ہو جائے اور سارے لوگ آرام کرنے چلیں، وہ سکون کا وقت ہوگا، آپ اسی وقت چل کر طواف کر لیجیے، تا کہ کوئی شخص آپ کو دیکھ نہ سکے۔

اسی پلاننگ کے تحت آپ دوپہر کے سناٹے میں حرم کعبہ پہنچے اور طواف کرنے لگے، لیکن ٹھیک اسی وقت اچانک وہاں ابوجہل بھی آدھمکا اور کہنے لگا: ''یہ کون شخص ہے جو کعبہ کا طواف کون کر رہا ہے؟'' حضرت سعد نے جواب دیا: ''میں سعد ہوں۔''

ابوجہل نے کہا: ''تم یہاں بے خطر کعبے کا طواف کر رہے ہو اور وہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے ساتھیوں کو پناہ دے رکھی ہے؟''

جب امیہ نے دیکھا کہ بات بڑھ رہی ہے تو اس نے حضرت سعد سے کہا: ''سعد! تم ابوالحِکم (ابوجہل) کے سامنے اونچی آواز سے نہ بولو۔ یہ اس وادی کا سردار ہے۔''

یہ سن کر حضرت سعد نے کہا: ''اللہ کی قسم! اگر تم نے مجھے بیت اللہ کے طواف سے روکا تو میں بھی تمہاری شام کی تجارت خاک میں ملا دوں گا۔''(۲)

---

(۱)سنن أبی داؤود، کتاب الخراج والفيء والإمارة، باب ماجاء في خَبر بني النضير، ح: ۳۰۰۴

(۲)البخاری، کتَاب الْمَنَاقِب، بَابُ عَلاَمَاتِ النُّبُوَّةِ فِي الإِسْلاَمِ، حدیث: ۳۶۳۲

۱۰۔جب اس میں کامیابی نہیں ملی تو خود ہی مدینے پر حملے کی تیاری کرنے لگے۔مدینے کے یہودی قبائل نے جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بڑھتی مقبولیت دیکھی تو حسد میں مبتلا ہو گئے اور اہل مکہ کے ساتھ مل کر سازش کرنے لگے۔اسی چوطرفہ یلغار سے نپٹنے کے لیے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت ملی اور سورۂ حج کی حسب ذیل آیات نازل ہوئیں:

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ۟ﰳ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا وَ لَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌﰴ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِﰵ

’’جن کے اُوپر مظالم ڈھا کر اُن کے خلاف جنگ مسلط کی گئی ہے، اُنھیں جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔بے شک اللہ اُن کی مدد پر قادر ہے۔یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ناحق اُن کے گھروں سے نکالا گیا، ان کا جرم یہی تھا کہ وہ فقط اللہ کو اپنا رب کہہ رہے تھے۔اگر اللہ تعالیٰ انسانوں کے مختلف طبقات کو ایک دوسرے پر تسلط سے نہ روکتا تو ضرور ساری خانقاہیں، درس گاہیں، کنیسے اور مسجدیں۔جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر ہوتا ہے۔سب کے سب منہدم کر دیے جاتے۔حق تعالیٰ یقیناً ان کی مدد کرتا ہے جو حق کی مدد کرتے ہیں۔بے شک اللہ ہی قوت اور غلبے والا ہے۔یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر زمین پر ہم اُن کا اقتدار قائم کر دیں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکات دیں گے، خیر کا حکم دیں گے اور شر سے روکیں گے، اور یقیناً ہر معاملے کا انجام کار اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔‘‘

۱۱۔اب جب جنگ شروع ہوئی تو اس کا سلسلہ چل نکلا۔اہل مکہ نے اسلام اور مسلمانوں کو اپنے آبائی مذہب کے لیے خطرہ بتا کر تمام قبائل عرب کو اپنا ہم نوا بنا لیا اور اس شمع حق کے بجھانے کے درپے ہو گئے جس کو آفاق میں روشن کرنا حق تعالیٰ کو منظور تھا۔(۱)

---

(۱) یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (الصّف:۸)

۱۲۔دشمنان ملہ کا پھیلایا ہوا یہی فریب تھا کہ فتح مکہ کے بعد اگرچہ مسلمانوں کی شوکت وقوت آشکار ہوگئی اور قبائل عرب بالعموم زیر ہو گئے، مگر پھر قبیلہ ہوازن اور قبیلہ بنی ثقیف نے اس دین کو مٹانے کے لیے سر سے کفن باندھ لیا، جس کے نتیجے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جنگ حنین کا سامنا کرنا پڑا۔ اس آخری مورچے کے بعد پورا عرب اسلام کے زیر اقتدار آ گیا اور اندرون عرب کوئی مزاحم طاقت نہیں بچی، لیکن اب شورش کا آغاز بیرون عرب سے ہوا۔ روئے زمین کے سپر پاور سلطنت روما اور قیصر روم، جو اب تک مسلمانوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے، یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے کہ یہ عرب کی سب سے بڑی طاقت بن چکے ہیں اور مرکز اسلام مدینہ منورہ پر حملے کی تیاری شروع کر دی۔ شمال مغربی قبائل کو بھی انہوں نے اپنے ساتھ ملا لیا، سرحد پر فوج جمع کرنے لگے اور اس علاقے میں بھیجے گئے داعیان اسلام کو بھی تہِ تیغ کر دیا۔ اب پیغمبر اسلام۔ جو فن ضرب وحرب کے بھی امام تھے۔ نے مناسب اور ضروری سمجھا کہ بڑھ کر حملہ کیا جائے، آپ کی قیادت میں جنگ تبوک اور حضرت اسامہ کی امارت میں عظیم لشکر کشی اسی نئے فتنے کے سدباب کے لیے تھی۔

۱۳۔اہل عرب کے سامنے اسلام ایک نیا انقلاب تھا جس کی مادی وروحانی طاقتیں ناقابل تسخیر تھیں۔ مسلمان ایک آفاقی انسانی دعوت لے کر اٹھے تھے۔ توحید الٰہ اور توحید آدم کا اسلامی فلسفہ اتنا مستحکم تھا کہ عرب مشرکین کی شکست کے بعد اب رومی مسیحی اور ایرانی آتش پرست خائف تھے۔ وہ اسلام کی دعوت کو روکنا چاہتے تھے اور مسلمان توحید حق اور مساوات خلق کے فلسفے کو آفاق تک پہنچا دینا چاہتے تھے۔ یہی کشمکش افکار مسلمانوں کو روکنے اور بڑھنے کا سبب بنی اور مسلمان ہر رکاوٹ کے بعد اور جوش وخروش کے ساتھ آگے بڑھتے چلے گئے۔ یوں دین کی اشاعت تو ہمیشہ اس کے آفاقی انسانی اصولوں کے سبب از خود ہوتی گئی۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی تلوار نے اسلام کو پھیلانے میں نہ سہی، بچانے میں ضرور اپنا کردار ادا کیا۔

۱۴۔ یہ شاہی وسلطانی عہد تھا۔ سرحدوں کی قانونی تعیین وتحدید تو اقوام متحدہ کی تشکیل (۱۹۴۵ء) کے بعد ہوئی، لیکن اس سے پہلے تو طاقت ہی سرحدوں کا تعین کرتی تھی یا سرحدوں کی وسعت سے ہی طاقت کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔ طاقت کے بل بوتے پر اپنی

سرحد کی توسیع ایک خاموش بین الاقوامی قانون تھا۔ ممکن ہے کہ اس قانون سے بعض مواقع پر دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں نے بھی فائدہ اٹھایا ہو، لیکن خیرالقرون میں زیادہ تر مسلمانوں نے اپنے دفاع کے لیے ہی اقدام کیا۔ البتہ جیسے جیسے حقیقی روح جہاد مضمحل ہوتی گئی، ''شہادت حق'' کے بجائے ''مال غنیمت اور کشور کشائی'' مسلمانوں کا مطمح نظر بنتا چلا گیا۔ یہ ایک تفصیل طلب اور انتہائی دل چسپ موضوع ہے، لیکن ہماری اصل بحث، اصلِ جہاد اور سببِ جہاد سے ہے، جس کی بنیادیں کتاب اللہ اور سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پیوست ہیں۔

الغرض! جنگ اسلام کی کبھی ترجیح نہیں تھی، خود حالات نے اس پر جنگ مسلط کی۔

وجہِ جنگ۔ظلم وفساد کا خاتمہ

کتاب وسنت کے تمام نصوص کو باہم مربوط کر کے دیکھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام میں جنگ کی وجہ روئے زمین سے فتنہ وفساد کا خاتمہ ہے۔اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اہل اسلام کی جنگ کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں؛**الف:**مسلمانوں کی جنگ مسلمانوں کے ساتھ۔**ب:**مسلمانوں کی جنگ غیر مسلموں کے ساتھ

الف: پہلے نکتے کی بات کریں تو یہ نہ صرف ناجائز اور حرام ہے، بلکہ ایک کافرانہ عمل ہے۔حدیث پاک میں ہے: سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ۔(صحیح بخاری، حدیث: ۶۰۷۶)کسی مسلمان کو گالی دینا فاسقانہ عمل ہے اور اُس سے جنگ کرنا کافرانہ عمل ہے، جب کہ نام نہاد جہادی تنظیموں نے اپنے مخالف فکر مسلمانوں کے خلاف بربریت کی انتہا کردی۔

تاہم بعض ناگزیر صورتوں میں شریعت میں اس کا جواز بھی موجود ہے۔یہ وہ صورت ہے جب اسلامی ریاست کے اندر کچھ لوگ آپس میں لڑ پڑیں یا حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوجائیں اور اس وقت اس جنگ کی چنگاریوں کو بجھانے کے لیے جنگ ناگزیر ہوجائے۔اس صورت حال کے حوالے سے قرآن پاک میں حسب ذیل رہنمائی موجود ہے:

وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۝۹ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝۱۰ (حجرات)

''اگر اَہل ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے بیچ صلح کراؤ، لیکن اگر اُن میں سے ایک دوسرے کے خلاف سرکشی پر آمادہ ہو جائے، تو سرکش گروہ سے جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ حکم الٰہی کی طرف لوٹ آئے۔ لہٰذا جونہی وہ اپنی سرکشی سے باز آئے اب ان دونوں کے بیچ انصاف کے ساتھ صلح کرادو اور اُس وقت انصاف کا دامن تھامے رہو، اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ بے شک اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ لہٰذا اَپنے دو بھائیوں میں صلح کراتے رہو اور اِس سلسلے میں اللہ سے ڈرتے رہو، تا کہ تم پر رحمت الٰہی کا نزول ہو۔''

غور کیجیے! اس آیت کریمہ میں واضح طور پر یہ حکم ہے کہ دو مسلم فریق میں جنگ چھڑ جائے تو حکومت واقتدار کو چاہیے کہ ان کے بیچ مصالحت کرانے کی پوری کوشش کرے اور اگر اُس کے بعد بھی ان میں سے کوئی فریق سرکشی اور فساد پر آمادہ ہو تو طاقت اور جنگ سے اس کی سرکشی کو کچل دیا جائے، پھر جونہی وہ رام ہو، عدل وانصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے بیچ مصالحت کرادی جائے۔

ب: جہاں تک غیر مسلموں کے ساتھ جنگ کا معاملہ ہے تو اِس سلسلے میں بھی اسلامی فلسفۂ جنگ دفع شر اور اِزالۂ فساد پر مبنی ہے۔ اہل اسلام کو مکہ میں مخالفین کی طرف سے سخت ترین مظالم (*persecutions*) سے گزرنا پڑا۔ گالیوں، بدتمیزیوں اور زدوکوب (*mob lynching*) کا سامنا رہا۔ انفرادی سطح پر اُن کی موب لنچنگ کی گئی اور تین سال تک شعب ابی طالب میں اجتماعی طور پر ان کا سماجی بائیکاٹ کر دیا گیا۔ بالآخر اُنھیں حبشہ اور پھر مدینہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔

حبشہ میں وقتی طور پر سکون ملا، مگر پھر جلد ہی مکہ میں رہ گئے اقربا کے ساتھ مظالم کی خبریں آنے لگیں اور مدینہ اہل مکہ کی سازشوں کی آماج گاہ بن گیا۔ یہی نہیں، بلکہ اب تو وہ باضابطہ مدینے پر حملے کی تیاریاں کرنے لگے۔ یہ سب دیکھ کر اہل ایمان کا جی کڑھتا اور وہ انتقامی جنگ کے لیے اُٹھ کھڑا ہونا چاہتے، مگر ہر بار اُنھیں بارگاہ رسالت سے یہ کہہ کر رُوک دیا جاتا کہ ابھی اس کی اجازت نہیں ہے۔ اب اس کے بعد اِذنِ جنگ کے سلسلے میں پہلی آیت نازل ہوتی ہے:

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝٣٩ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝٤٠ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝٤١ (حج)

''جن کے اُوپر مظالم ڈھا کر اُن کے خلاف جنگ مسلط کی گئی ہے، اُنھیں جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ بے شک اللہ اُن کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ناحق اُن کے گھروں سے نکالا گیا، ان کا جرم یہی تھا کہ وہ فقط اللہ کو اپنا رب کہہ رہے تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسانوں کے مختلف طبقات کو ایک دوسرے پر تسلط سے نہ روکتا تو ضرور ساری خانقاہیں، درس گاہیں، کنیسے اور مسجدیں۔جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر ہوتا ہے۔سب کے سب منہدم کر دیے جاتے۔حق تعالیٰ یقیناً ان کی مدد کرتا ہے جو حق کی مدد کرتے ہیں۔ بے شک اللہ ہی قوت اور غلبے والا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر زمین پر ہم اُن کا اقتدار قائم کر دیں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکات دیں گے، خیر کا حکم دیں گے اور شر سے روکیں گے، اور یقیناً ہر معاملے کا انجام کار اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔''

ان آیات کریمہ میں مسلمانوں کو سب سے پہلے جنگ کی اجازت دی گئی اور اس جنگ کا جواز مسلمانوں پر ظلم و جبر اور اُن کی جلاوطنی کو قرار دیا گیا۔ اس سے آگے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ دراَصل جنگ کی یہ اجازت نظام الٰہی کا حصہ ہے، جس کے مطابق حق تعالیٰ مظلوموں کی ظالموں سے حفاظت فرماتا ہے۔ یہ اس لیے تاکہ راہبوں کی خانقاہیں، مسیحیوں کے گرجے، یہودیوں کے کنیسے اور مسلمانوں کی مسجدیں انہدام سے محفوظ رہیں۔ گویا اجازت جنگ کے ضمن میں آزادی مذہب اور حفاظت انسانیت کی ضمانت دے دی گئی۔ ساتھ میں یہ بھی بتایا گیا کہ یہ اجازت اُن کے لیے ہے جو تقویٰ، عبادت اور عدل کے حاملین ہیں، نہ کہ ان کے لیے جو خود سری، نفس پرستی اور ظلم و جبر کے خوگر ہیں۔

اس کے بعد سورۂ بقرہ کی آیات (۱۹۰۔۱۹۴) نازل ہوئیں اور جنگ کا باضابطہ حکم دیا گیا اور اس کے آداب بتائے گئے۔ارشاد ہوا:

وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَ لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ (بقرہ)

”جو لوگ تم سے جنگ کریں، ان سے اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور حد سے نہ بڑھو، بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ان دہشت گردوں کو جہاں پاؤ اُنھیں قتل کردو اور جہاں سے اُنھوں نے تم کو جلاوطن کیا تم بھی وہاں سے اُنھیں جلاوطن کردو۔ حقیقت یہ ہے کہ فتنہ انگیزی قتل سے بھی سنگین جرم ہے۔البتہ! ان سے مسجد حرام کے قریب جنگ نہ کرنا، اِلا یہ کہ وہ خود تم سے وہاں آمادۂ جنگ ہو جائیں۔اگر وہاں وہ جنگ پر آمادہ ہوں تو اُنھیں قتل کر ڈالنا۔سرکش منکرین کا یہی انجام ہے۔پھر اگر وہ جنگ سے باز آجائیں تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔اور ان سرکش کفار سے اس وقت تک لڑتے رہو جب تک کہ فتنے کا خاتمہ نہ ہو جائے اور دین اللہ کے تابع نہ بن جائے۔ چناں چہ اگر یہ جنگ سے رک جاتے ہیں تو ان پر کوئی زیادتی جائز نہیں ہوگی، سوائے اُن کے جن کا ظلم پہلے سے ثابت ہے۔حرمت والے مہینے کا پاس اسی وقت رکھا جائے گا جب وہ اس کا پاس رکھیں اور بہر کیف! اس ماہ میں ہونے والی ان کی زیادتیوں کا بدلہ لیا جائے گا۔لہٰذا جو کوئی تمہارے خلاف سرکشی کرے تم اس سے اسی کے مطابق بدلہ لو اور اس سلسلے میں اللہ سے ڈرتے رہو، کیوں کہ اللہ اُنھیں کے ساتھ ہے جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔“

ان آیات میں مسلمانوں کو انہی کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم ہوا جو خود آمادۂ جنگ ہوں۔ لیکن ساتھ ہی اس بات کی بھی تاکید کی گئی کہ اس جنگ میں اعتدال اور اِنصاف کا دامن نہیں چھوڑنا ہے، بدلہ لینے میں حد سے آگے نہیں بڑھنا ہے، پھر دشمن جنگ روک دے تو جنگ روک دینا ہے۔ اس بات کی بھی تذکیر فرمادی کہ اللہ تعالیٰ انصاف واعتدال سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

ان آیات کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ جنگ کی بنیاد بھی خود کو اُن کے ظلم وجبر سے بچانا اور روئے زمین پر اَمن وانصاف قائم کرنا ہے۔ مذہبی جبر واِکراہ کے لیے بہر کیف جنگ کی اجازت نہیں ہے۔ اس فلسفے کو قرآن نے متعدد مقامات پر بیان فرمایا ہے۔ اس کے لیے سورۂ نسا (۷۵، ۸۴، ۹۰، ۹۱)، سورۂ انفال (۳۹) اور سورۂ توبہ (۱۲، ۱۳، ۳۶) بطور خاص دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس فلسفے کی توثیق وتائید فقہاے اسلام کے مختلف ارشادات سے بھی ہوتی ہے۔ بطور مثال چند حوالے ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ اجتہادی شان کے مالک معروف مفسر قرآن علامہ ابن جریر طبری (۳۱۰ھ) آیت کریمہ وَإِنۡ جَنَحُوا۟ لِلسَّلۡمِ فَٱجۡنَحۡ لَهَا (انفال:۶۱) کے تحت رقم طراز ہیں:

وإن مالوا إلى مسالمتك ومتاركتك الحربَ، إما بالدخول في الإسلام، وإما بإعطاء الجزية، وإما بموادعة، ونحو ذلك من أسباب السلم والصلح (فاجنح لها)، يقول: فمل إليها، وابذل لهم ما مالوا إليه من ذلك وسألوكه۔ (تفسير الطبری)

اگر کفار قبول اسلام، اداے جزیہ، معاہدہ یا اور کسی بھی پر امن طریقے سے آپ سے مصالحت اور ترک جنگ کے لیے آمادہ ہوں تو آپ بھی اس کے لیے آمادہ ہوجائیں اور اس کے لیے جس بات کے وہ مطالب ہوں آپ بھی اسے قبول فرمائیں۔

۲۔ جہادی تحریکات کے سب سے معتبر عالم علامہ ابن تیمیہ (۷۲۸ھ) لکھتے ہیں:

الكفار إنما يُقاتلون بشرط الحراب؛ كما ذهب إليه جمهور العلماء، وكما دل عليه الكتاب والسنة۔ [1]

---

[1] النبوات، الباب الثاني: قسم التحقيق، فصل ما يخالف الكتاب والسنة فهو باطل

کفار سے جنگ کا جواز اسی شرط سے مشروط ہے کہ وہ جنگ میں پیش قدمی کریں، جیسا کہ جمہور علماے اسلام کا یہی موقف ہے اور یہی کتاب وسنت کا مدلول ومطلوب بھی ہے۔

۳۔اس حلقے کے دوسرے بڑے عالم علامہ ابن قیم جوزیہ(۷۵۱ھ) لکھتے ہیں:

ولم يُكْرِه أحدًا قط على الدين، وإنما كان يقاتل من يحاربه ويقاتله، وأما من سالمه وهادنه: فلم يقاتله۔ (۱)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو اسلام کے لیے مجبور نہیں کیا، آپ نے صرف انہیں لوگوں سے جنگ کی جنھوں نے آپ سے جنگ کی، جو لوگ صلح وامن کے ساتھ پیش آئے ان کے خلاف جنگ نہیں کی۔

۴۔معروف حنفی فقیہ علامہ کمال الدین ابن ہمام (۸۶۱ھ) جہاد کی فرضیت پر گفتگو کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

أَنَّ النَّصَّ مَقْرُونٌ بِمَا يُقَيِّدُهُ بِغَيْرِهِمْ وَهُوَ مِنْ حَيْثُ يُحَارَبُ لِقَوْلِهِ تَعَالَى وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً [التوبة: ۳۶] فَأَفَادَ أَنَّ قِتَالَنَا الْمَأْمُورَ بِهِ جَزَاءٌ لِقِتَالِهِمْ وَمُسَبَّبٌ عَنْهُ، وَكَذَا قَوْله تَعَالَى وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لا تَكُونَ فِتْنَةٌ [البقرة: ۱۹۳] أَيْ لَا تَكُونَ مِنْهُمْ فِتْنَةٌ لِلْمُسْلِمِينَ عَنْ دِينِهِمْ بِالْإِكْرَاهِ بِالضَّرْبِ وَالْقَتْلِ۔ (فتح القدیر: ۵/۴۳۸)

جہاد سے متعلق قرآنی نص میں ایسے قیود موجود ہیں جن سے تخصیص ہوجاتی ہے، اس طور پر کہ جہاد صرف ان پر فرض ہے جن پر جنگ مسلط کی جائے۔ ارشاد باری ہے: ان تمام مشرکین سے جنگ کرو جیسا کہ یہ سب تم سے جنگ کر رہے ہیں۔ (توبہ: ۳۶) اس سے واضح ہوا کہ ہم پر جو جنگ فرض ہے وہ فقط دشمنوں کی طرف سے چھیڑی گئی جنگ کا ردعمل اور نتیجہ ہے۔ اسی طرح اللہ کا یہ ارشاد کہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہوجائے (بقرہ: ۱۹۳) مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے دین کے معاملے میں دوسروں کی طرف سے ضرب وقتل جیسے جبری فتنے کا خاتمہ ہوجائے۔

---

(۱) هداية الحياری في أجوبة اليهود والنصاری، القسم الأول أجوبة المسائل، المسألة الأُولى

۵۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ (۱۲۲۵ھ) آیت کریمہ **وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ** (بقرہ:۲۵۱) کے تحت بہت واضح لفظوں میں فرمایا: فیہ دلیلٌ علی أن العلۃَ لافتراضِ الجہادِ دفعُ الفساد۔ اس آیت میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ فرضیت جہاد کی علت دفع فساد ہے۔

اسی طرح آیت کریمہ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (بقرہ:۲۵۶) کے ذیل میں فرمایا:

فان الأمر بالقتال والجهاد ليس لاجل الإكراه على الدين بل لدفع الفساد من الأرض۔ (التفسیر المظھری)

جہاد وقتال کا حکم دین میں جبر کرنے کے لیے نہیں، بلکہ زمین سے فساد کے خاتمہ کے لیے ہے۔

۶۔ علماے دیوبند کے سرخیل مولانا اشرف علی تھانوی (۱۳۶۲ھ) رقم طراز ہیں:

''حسب تصریح حکماے امت کما فی الھدایہ وغیرھا سیف [جہاد] کی غرض اعزاز دین ودفع فساد ہے۔'' (بوادر النوادر، ص:۵۰۸)

۷۔ ایک دوسرے دیوبندی عالم مولانا شبیر احمد عثمانی (۱۳۶۹ھ) کی رائے بھی اس سیاق میں قابل ذکر ہے۔ رقم طراز ہیں:

'' جہاد بالسیف خواہ ہجومی ہو (یعنی بطریق حفظ ماتقدم)[surgical strike] یا دفاعی (یعنی بطریق چارہ سازی)[self defence] صرف مومنین کی حفاظت کے لیے [ہے] اور یہ ایک ایسا فطری حق ہے جس سے کوئی عقل منداور مہذب انسان مسلمانوں [یا کسی دوسری قوم] کو محروم نہیں کرسکتا۔'' (۱)

الغرض! قدیم وجدید کثیر علما کی تحقیق وتصریح یہی ہے کہ اسلام میں جواز جنگ کی بنیاد، ظلم وفساد کا خاتمہ ہے۔ دیگر بہت سے علما نے اس کے خلاف بھی باتیں کی ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان کی آرا، عقل انسانی، حقوق انسانی، مقاصد شرع اور بے شمار آیات قرآنیہ اور سیرت نبویہ کے خلاف اور عصری فہم وشعور سے ماورا ہیں۔

❁❁❁

(۱) الشہاب لرجم الخاطف المرتاب، مشمولہ تالیفات عثمانی، ادارہ اسلامیات، لاہور، ص:۵۵۰

اسلامی فلسفۂ جنگ پر چند سوالات

سطور بالا میں اسلامی فلسفۂ جنگ کو بیان کرتے ہوئے اسلام میں جواز جنگ کی جو وجہ۔ظلم وفساد کا خاتمہ۔بیان کی گئی، اس پر داخلی اور خارجی سطح پر سوالات قائم کیے جاتے ہیں۔یعنی اس پر سوال اٹھانے والے بعض غیر مسلم بھی ہیں اور بعض مسلمان بھی ہیں جو غیر شعوری طور پر غیر مسلموں کو خام مواد فراہم کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ان سوالات کا حاصل یہ ہے کہ اسلام میں جواز جنگ کی بنیاد صرف ''ظلم وفساد کا خاتمہ'' نہیں، بلکہ اس کے دیگر اسباب بھی ہیں۔مثلاً:

ا۔بعض آیات مثلاً قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ الخ (سورۂ توبہ:۲۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کفر کے خلاف بھی جنگ چاہتا ہے۔

۲۔بعض مسلم دانشوروں نے لکھا ہے کہ اسلام اقامت دین کے لیے دنیا سے شوکت کفر کو مٹا دینا چاہتا ہے، پھر اس کی کیا حقیقت ہے؟

۳۔قرآن میں یہ بھی ہے: وَقٰتِلُوۡهُمۡ حَتّٰی لَا تَکُوۡنَ فِتۡنَةٌ وَّ یَکُوۡنَ الدِّیۡنُ لِلّٰهِ﴿۱۹۳﴾ (بقرہ) ان سرکش کفار سے اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک کہ فتنے کا خاتمہ نہ ہو جائے اور دین، اللہ کے تابع نہ بن جائے۔سوال یہ ہے کہ یہاں فتنے سے کیا مراد ہے؟

۴۔آیت سیف کو عام مفسرین نے ناسخ کہا ہے، جب کہ اسلامی فلسفۂ جنگ کی مذکورہ تشریح عدم نسخ پر مبنی ہے۔

آنے والے صفحات میں یہ اور اس قسم کے دیگر شبہات کی وضاحت کی جاتی ہے۔

✽✽✽

پہلا سوال

کیا اسلام کفر کے خلاف جنگ چاہتا ہے؟

اس سلسلے میں ایک سب سے مشہور سوال یہ ہے کہ اسلام میں صرف فساد و بغاوت کا خاتمہ ہی نہیں، خود کفر بھی جنگ و جہاد کا سبب ہے۔ یا اُسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ اسلام میں جنگ کا باعث فقط فساد کا خاتمہ ہے تو کفر خود بھی ایک فساد ہے، لہٰذا اس کے خاتمے کے لیے بھی اسلام میں جنگ کا جواز موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تک روئے زمین پر کفر باقی ہے، اس کے خلاف اسلامی جنگ یا اسلامی جہاد جاری رکھنا ایک دینی و ملی فریضہ ہے۔ اس نظریہ کے حاملین ـ مسلم و غیر مسلم ـ حسب ذیل آیات سے استدلال کرتے ہیں:

پہلی آیت

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ (سورہ توبہ)

وہ اہل کتاب جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اللہ و رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے اور جو دین حق سے الگ ہیں، اُن سے جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ تم کو جزیہ ادا کرنے لگیں اور تمہاری بالادستی قبول کر لیں۔

کفر کو جواز جنگ بنانے کے سلسلے میں اس آیت سے استدلال واضح ہے۔ خلاصۂ استدلال یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں ان اہل کتاب سے جنگ کرنے کا حکم ہے جو کفر پر

ہیں اور اِسلام کی صداقت کے منکر ہیں اور اسی سے واضح ہوجاتا ہے کہ کفر کا خاتمہ بھی وجہِ جنگ ہے۔

اِستدلال مذکور کی تردید کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں جن باغیوں، سرکشوں، دہشت گردوں اور مسلمانوں کے خلاف سازش کرنے والوں سے جنگ کا حکم دیا گیا ہے، اتفاق یہ ہے کہ ان کا وصف یہ ہے کہ وہ نہ تو اللہ کی ذات اور آخرت کے وجود پر کما حقہ ایمان رکھتے ہیں اور نہ ہی دین حق اسلام کا اتباع کرتے ہیں۔ اِس لیے صفات مذکورہ جن کو اِجمال کے ساتھ کفر کہا جائے، یہاں بھی جنگ کی بنیاد نہیں ہیں، یہاں بھی جنگ کی بنیاد شر و فساد، فتنہ انگیزی اور سازش ہی ہے۔ البتہ! ان فسادیوں کے جو اعتقادی اور اخلاقی اوصاف ہیں، یہاں ان کو بھی نقل کر دیا گیا ہے اور یہ نقل بھی بلا وجہ نہیں ہے، بلکہ اہل ایمان کو دراصل یہ بتانے کے لیے ہے کہ اہل کتاب کے دعویٔ دین اور ظاہری دین داری کے سبب ان کے ساتھ جنگ میں تردد نہ کریں، کیوں کہ ایک طرف تو وہ سازشی اور فسادی ہیں اور دوسری طرف وہ صحیح معنوں میں دیندار بھی نہیں ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دین داری کے لبادے میں وہ دین فروش ہیں۔ توحید کی حقیقت کو اپنی بے جا تفسیرات سے مسخ کر دیا ہے، نبیوں کو وہ یا تو مانتے نہیں یا پھر غلط طریقے سے مانتے ہیں، اُن کے فقہا اور رِبّی تفہیم شرع کے بجائے وضع شرع کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور یہ آنکھ بند کر کے ان کے حلال و حرام کو تسلیم کرتے ہیں۔

یہ مضمون قرآن پاک میں ایک سے زائد مقام پر بیان کیا گیا ہے۔ خود آیت مذکورہ میں جو اجمال ہے، اس کی تفصیل اس کے بعد کی آیات میں اس طرح سے کر دی گئی ہے کہ یہود حضرت عزیر کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں، مسیحی حضرت مسیح کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں۔ (آیت: ۳۰) وہ مسیح کی پرستش کرتے ہیں اور اپنے علما و مشائخ کو شریعت ساز سمجھتے ہیں۔ (آیت: ۳۱) اُن کی کوشش ہے کہ وہ چراغ حق کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں، جب کہ اللہ تعالیٰ حق کا اجالا پورے طور پر عام کرنا چاہتا ہے۔ (آیت: ۳۲، ۳۳) ان کے علما و مشائخ حرام خوری کرنے اور لوگوں کو رَاہ حق سے روکنے میں لگے ہیں۔ (آیت: ۳۴)

جن اہل کتاب سے جنگ کا حکم ہوا، ان کی اعتقادی اور اخلاقی صفات یہاں مکمل ہوئیں۔ یہاں پہنچ کر واضح ہوتا ہے کہ ان سے جنگ کی بنیاد ان کا عقیدۂ کفر نہیں ہے جس پر

وہ قائم ہیں، یہ تو محض ان کی نام نہاد دین داری کی ایک تصویر ہے، ان کے خلاف جنگ کے جواز کی اصل بنیاد ان کا وہ تمرد اور سرکشی ہے جس کے سبب وہ خلق کو حق سے روکنے اور شمع اسلام کو بجھا دینے کے درپے ہیں۔

اب اس مسئلے کو تاریخی زاویے سے دیکھیے۔ اہل اسلام کا اہل کتاب سے رابطہ ہجرت کے بعد شروع ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد اہل کتاب سے معاہدہ اور اُن سے اس وقت تک جنگ نہیں کی، جب تک اُنھوں نے ایسے کام نہ کیے جن کی وجہ سے وہ سارے معاہدے ٹوٹ کر بکھر گئے۔ مثلاً یہود نے اہل اسلام کے خلاف مخبری کی، مشرکین عرب کے ساتھ مل کر ان کے خلاف جنگ کی سازش کی، اُنھیں مسلمانان مدینہ پر حملے کی دعوت دی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کی سازشیں رچیں۔ حضور اکرم ﷺ کی شان میں ہجو گوئی کی۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہجرت کے تیسرے سال کعب بن اشرف یہودی کے قتل، چوتھے سال بنونضیر کی جلاوطنی، پانچویں سال بنوقریظہ کے قتل وقید اور ساتویں سال فتح خیبر کا سبب ان کے یہی جرائم بنے۔

آٹھویں صدی ہجری سے مسیحیوں کے ساتھ تصادم شروع ہوا۔ ہجرت کے آٹھویں سال رومی مسیحیوں اور ان کے حلیف سرحدی عربوں کے خلاف اردن کے مقام موتہ میں جنگ موتہ اور نویں سال مقام تبوک میں معرکۂ تبوک پیش آیا۔ ان دونوں معرکوں کے محرک رومی مسیحی تھے جو اسلام کے سائے میں عربوں کی بڑھ رہی ایک نئی طاقت کو کچل دینا چاہتے تھے۔ جنگ موتہ میں تین ہزار مسلمان دو لاکھ رومیوں اور غسانیوں کے مقابل تھے، جب کہ جنگ تبوک میں تیس ہزار مسلم فوج چالیس ہزار مسیحی فوج کے بالمقابل تھی۔ کون کس کو ختم کرنا چاہتا تھا، اس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جنگ موتہ کا پس منظر یوں ہے کہ ہجرت کے پانچویں سال جنگ خندق (احزاب) میں جب کہ قریش اور ان کے سارے ہم نوا مسلمانوں کو ختم کرنے آئے تھے، لیکن شکست سے دوچار ہوئے۔ اس سے ان کے حوصلے پست ہوگئے۔ مسلمانوں کی یہی فتح اگلے سال صلح حدیبیہ کا سبب بنی۔ بعد ازاں فرصت اور امن کے حالات کو غنیمت سمجھتے ہوئے پیغمبر اسلام ﷺ نے سلاطین عالم اور سربراہان مملکت کو اسلام کی دعوت کے لیے خطوط

لکھے۔ اس ضمن میں آپ نے بُصریٰ(۱) کے حاکم شرجیل بن عمرو غسانی کو بھی خط لکھا۔شرجیل نے کبر ونخوت اور جوش غضب میں سفیر اسلام حضرت حارث بن عمیر ازدی رضی اللہ عنہ کوشہید کر ڈالا۔اس کا یہ عمل بین الاقوامی اصولِ سفارت کی خلاف ورزی اور جنگ کا اعلان تھا۔اسی کے نتیجے میں جنگ موتہ کا واقعہ پیش آیا۔یکے بعد دیگرے تین سپہ سالاران اسلام زید بن حارثہ،جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ کی شہادت کے بعد حضرت خالد بن ولید نے قیادت سنبھالی اور بالآخر فتح وظفر سے ہم کنار ہوئے۔

اس وقت مسلمان فتح مکہ سے فارغ ہو چکے تھے اور تقریباً پورا عرب مسلمانوں کے زیر سایہ آچکا تھا۔خانۂ توحید میں آئندہ قیامت تک کے لیے مشرکین کا داخلہ ممنوع کر دیا گیا تھا۔لیکن اب شام کے سرحدی علاقوں میں رومیوں کے خطرات بڑھ گئے اور بطور خاص جنگ موتہ میں شکست فاش کے بعد رومیوں نے صفحۂ ہستی سے مسلمانوں کا وجود مٹا دینے کا عزم کرلیا اور شامی علاقوں میں ایک لشکر جرار جمع کرنے لگے۔سورۂ توبہ کی مذکورہ بالا آیت (۲۹) اسی پس منظر میں نازل ہوئی۔اس سے صاف واضح ہے کہ اہل کتاب کے خلاف جنگ کے حکم کی علت ان کا کفر نہیں، بلکہ ان کی سرکشی،فتنہ انگیزی اور مسلمانوں کے خلاف جارحیت اور جنگ کی پیش قدمی ہے۔اگر اہل کتاب کے کفر کے خلاف جنگ کرنا ضروری ہوتا تو پھر کبھی اُن سے معاہدہ اور میثاق کا جواز ہرگز نہیں ہوتا۔اُن کے ساتھ جنگ کا حکم اُس وقت ہوا جب کہ اُنھوں نے کفر کے ساتھ فساد میں بھی خود کو مبتلا کرلیا۔

اِس پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب کے ساتھ اس وقت معاہدہ کیا جب سیاسی اعتبار سے ضعف کی حالت میں تھے اور جب قوت واقتدار میں آئے تو قرآن پاک نے ان کے خلاف جنگ کا حکم دیا اور آپ نے اُن سے جنگ کی۔

اس اعتراض کا پہلا جواب یہ ہے کہ یہ تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔اہل کتاب سے جنگ کا حکم قوت کے سبب نہیں ہے، بلکہ ان کی شرانگیزی اور فتنہ سامانی کے سبب ہے، جیسا کہ اس کی

(۱) بصریٰ جنوبی شام کا ایک قدیم شہر ہے جو دمشق سے تقریباً ۱۵۰ رمیل جنوب اور اردن کی سرحد سے ۱۹ رمیل شمال میں واقع ہے۔ یہ دمشق سے عمان جانے والی شاہراہ پر واقع ایک اہم شہر ہے۔ بصریٰ کے معنی بلند قلعہ ہیں اور اسے بصریٰ الشام بھی کہا جاتا ہے۔ عہد نبوی میں بصری الشام رومی سلطنت کے تحت غسانی حکومت کا صدر مقام تھا۔

وضاحت سطور بالا میں مذکور ہوئی۔ اس لیے واقعہ یہ ہے کہ اہل کتاب کے خلاف جہاد کی فرضیت اس وقت تک نہیں ہوئی، جب تک ان کے مکر و سازش اور ظلم کا سلسلہ اپنی حد سے نہیں بڑھ گیا۔

مولانا مودودی نے اپنی کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' کے باب پنجم میں ''چند مستثنیات'' کے ذیل میں اِس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور اگر بالفرض یہ اِعتراض تسلیم بھی کرلیا جائے، تو بھی اس سے اَصل مدعا پر کوئی فرق نہیں پڑتا، کیوں کہ پیش نظر آیت میں یہ حکم ہے کہ اُن کے خلاف اس وقت جنگ روک دی جائے جب وہ جزیہ کی ادائیگی کے لیے تیار ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ جزیہ پر رضامندی کے بعد بھی وہ کافر ہی رہیں گے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ کفر وجہِ جنگ نہیں ہے، ورنہ حکم یہ ہوتا کہ جب تک وہ کفر ترک کرکے اِسلام قبول نہ کرلیں تب تک اُن سے جنگ کرو۔

مذکورہ بالا اعتراض کے بے جا اور باطل ہونے کی مزید شہادت آنے والی سطور میں ''شوکت کفر کے خلاف جنگ'' کے تحت پیش کی جائے گی۔

دوسری آیت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ (توبہ)

اے ایمان والو! جو کفار تمہارے آس پاس ہیں، اُن سے جنگ کرو، وہ تمہارے اندر سختی محسوس کریں اور جان لو کہ بے شک اللہ متقی لوگوں کے ساتھ ہے۔

اس آیت کے ظاہری مفہوم سے بھی اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ کفر وجہِ جنگ ہے۔ مگر درست بات یہ ہے کہ یہ آیت کی نادرست تفہیم ہے۔ اس میں کفر کو وجہ جنگ نہیں بتایا گیا ہے، بلکہ ایک جنگی پالیسی بتائی گئی ہے کہ جب دشمن متعدد ہوں تو جنگ کا آغاز قریب والوں سے کیا جائے، دور والوں سے جنگ شروع نہ کی جائے، ورنہ یہ قریبی دشمن یا تو تمہاری ریاست پر حملہ کردیں گے یا تم جب دور والے دشمن کے ساتھ مصروف جنگ رہو گے تو پیچھے سے یہ تمہارے اُوپر حملہ کردیں گے۔ یہ ایک جنگی پالیسی ہے، جو عقل اور فطرت کے مطابق ہے۔ البتہ! اس آیت میں دشمن کی جگہ کافر کا لفظ اِس لیے بولا گیا ہے کہ اس وقت تمام غیر مسلم وہ خواہ عرب ہوں، یا یہود ونصاریٰ، اِسلامی ریاست کے خلاف آمادۂ جنگ تھے۔

یہ توضیح اِس لیے بھی معقول ہے کہ کتاب وسنت میں غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ معاہدہ کی مکمل پالیسی موجود ہے۔ اگر اہل کفر کے ساتھ جنگ ہی ناگزیر ہوتی تو پھر ان کے ساتھ صلح اور معاہدے کا جواز کیوں ہوتا؟ پھر یہ کہ جنگ کے بعد بھی غیر مسلموں کے قتل یا قبول اسلام کا حکم نہیں ہے، بلکہ اُن کے ساتھ عقد ذمہ کا حکم ہے۔ اگر کفر وجہِ جنگ ہوتا تو یہ حکم ہوتا کہ جب تک وہ کفر ترک نہ کردیں اور اِسلام قبول نہ کرلیں، اُن سے جنگ جاری رہے گی۔

ایک معروف روایت

یہیں سے اس حدیث کی بھی درست تفہیم ہوجاتی ہے جو اس سلسلے میں عام طور پر پیش کی جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے جنگ کروں جب تک کہ وہ ایک خدا کی گواہی نہ دے دیں، اس کے بعد وہ اپنی جان و مال کو مجھ سے محفوظ کرلیں گے، اِلا یہ کہ وہ کسی اور جرم سے اپنے خون کی حرمت کو پامال کردیں۔ أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوا: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، فَمَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، فَقَدْ عَصَمَ مِنِّي مَالَهُ، وَنَفْسَهُ، إِلَّا بِحَقِّهِ وَحِسَابُهُ عَلَى اللهِ۔ (متفق علیہ)

یہ حدیث صحیح ہے اور اُس کی بعض روایات میں رسالت محمدی کا اقرار اور بعض میں نماز اور استقبال قبلہ کا بھی ذکر ہے۔ اس سے بھی اول نظر میں یہ وہم ہوتا ہے کہ کفر کے خاتمہ کے لیے بھی جنگ جائز ہے۔ لیکن یہ استدلال بھی بوجوہ باطل ہے:

۱۔ یہ فہم، قرآن کی ان صریح آیات کے خلاف ہے جن میں ''اِکراہ فی الدین'' کی نفی کی گئی ہے۔ خود اسی روایت کے آخر میں پیغمبر علیہ السلام نے یہ آیت تلاوت فرمائی: إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (الغاشیۃ: ۲۱-۲۲) آپ لوگوں کے لیے ناصح ہیں، داروغہ نہیں۔ (مسلم، حدیث: ۳۵) اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں ظاہری معنی مراد نہیں ہیں۔

۲۔ یہ فہم، قرآن کی ان صریح آیات کے خلاف ہے جن کے اندر غیر مسلموں سے مصالحت اور مسالمت کا حکم دیا گیا ہے۔

۳۔ سیرت نبوی اس فہم کی قطعاً تائید نہیں کرتی۔ یعنی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تک جنگ کی ہو جب تک لوگوں نے اسلام قبول نہ کرلیا ہو اور قبول اسلام کے علاوہ آپ کسی دوسرے آپشن پر راضی نہ ہوئے ہوں۔

مذکورہ بالا تینوں شواہد، حدیث مذکور کے ظاہری فہم کی نفی کرتے ہیں۔ اب ایسے میں چوں کہ وہ حدیث صحیح ہے، اس لیے ممکنہ طور پر اس کی حسب ذیل تشریحات کی جاسکتی ہیں:

ا۔ وہ ارشاد بعض مخصوص سرکش، باغی، ظالم اور واجب القتل دشمنوں کے بارے میں ہوگا۔ اس لحاظ سے حدیث مذکور میں جو لفظ النَّاس ہے، اس میں ال عربی قواعد کے لحاظ سے عہد خارجی یا عہد ذہنی کے لیے ہے۔ یعنی جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی اس سے قبل ان مخصوص لوگوں کا باضابطہ ذکر کیا ہوگا، جن کو راوی نے چھوڑ دیا ہے، یا آپ ﷺ نے جب فرمایا ہوگا تو آپ کے اور صحابہ کے ذہنوں میں وہ مخصوص لوگ متصور و معہود ہوں گے۔ بہر کیف! النَّاس کا ال استغراق کے لیے نہیں ہے کہ سارے انسانوں پر اسے *apply* کیا جائے۔

۲۔ یہ حکم مسلمانوں کو آداب جنگ سکھانے کے لیے ہوسکتا ہے۔ یعنی یہ بتانے کے لیے کہ میدان جنگ میں بھی بد سے بدتر دشمن اگر تلوار کے نیچے آجائے اور اس حال میں بھی اگر وہ توحید و رسالت کی گواہی دے دے تو اس کی یہ گواہی جنگ میں *surrender* کرنا سمجھی جائے گی اور اس خیال سے کہ وہ محض جان بچانے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے اُس کی جان نہیں لی جائے گی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حدیث مذکور میں حَتّٰی کا لفظ وجہِ جنگ بیان کرنے کے لیے نہیں ہے، بلکہ انتہاے جنگ بیان کرنے کے لیے ہے۔ یعنی حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو توحید و رسالت کا اقرار نہیں کرتے، اُن کے ساتھ بہر صورت جنگ کی جائے گی، بلکہ یہ بتانے کے لیے ہے کہ جن کے ساتھ جنگ جاری ہو، اگر وہ توحید و رسالت کی گواہی دے دیں تو ایسی صورت میں اُن کے ساتھ جنگ روک دی جائے گی۔

اس مفہوم کی دوسری واضح روایات موجود ہیں۔ ممکن ہے مذکورہ بالا حدیث کا سیاق بھی وہی ہو، جس کی تائید دوسری واضح احادیث سے ہوتی ہے۔ اس کی یک گونہ تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب اہل خیبر کی وعدہ خلافیوں اور پیہم سازشوں کے سبب ان کے ساتھ جنگ ضروری ہوگئی تو فاتح خیبر حضرت علی کو پرچم اسلام عطا کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تم ان سے اس وقت تک جنگ کرنا جب تک وہ توحید و رسالت کا اقرار نہ کرلیں۔ قَاتِلْهُمْ حَتّٰى يَشْهَدُوا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللهِ اہل خیبر نے اسلام قبول نہیں کیا، بلکہ شکست کے بعد اسلامی ریاست سے معاہدہ کرنا چاہا اور حضرت علی

نے اُن سے جنگ روک دی اور معاہدہ کرلیااور اُنھیں اسلام کے لیے مجبور نہیں کیا۔یعنی حضور کے اس ارشاد سے حضرت علی نے بھی یہی سمجھا کہ ان کا ایمان لانا اِنتہائے جنگ کو ثابت کرے گا،لیکن ایمان نہ لانا اور کفر پر رہنا بہر صورت جنگ کو لازم نہیں کرے گا۔(۱)

۳۔حدیث مذکور میں أُقَاتِلَ النَّاسَ کے الفاظ آئے ہیں، أَقْتُلَ النَّاسَ کے الفاظ نہیں آئے ہیں۔یعنی جب تک وہ ایمان نہیں لاتے ان کے ساتھ مقاتلہ کا حکم ہے،ان کے قتل کا حکم نہیں ہے اور مقاتلہ میں طرفین کی مشارکت ہوتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر وہ ایمان نہیں لاتے اور مقاتلہ یعنی جنگ پر آمادہ ہوں تو ہم بھی ان سے جنگ کریں گے، البتہ!وہ ایمان لائے بغیر مقاتلہ پر آمادہ نہ ہوں تو ہمارے لیے جائز نہیں ہوگا کہ ہم ان کے خلاف ہتھیار اُٹھائیں اور اُنھیں قتل کریں۔امام ابن دقیق العید نے ایک مقام پر تارک نماز کے عدم قتل پر اِستدلال کرتے ہوئے، یہی طرز اپنایا ہے اور کہا ہے کہ حدیث پاک:’’ أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوا أَنْ لاَ إِلَهَ إِلَّا اللهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللهِ، وَيُقِيْمُوا الصَّلاَةَ‘‘میں قتل علی الصلاۃ کا حکم نہیں ہے،مقاتلہ علیٰ الصلاۃ کا حکم ہے۔لہٰذا اگر کوئی ترک صلاۃ کے ساتھ مقاتلہ پر آمادہ ہوگا تب اُسے قتل کیا جائے گا، ورنہ نہیں۔(۲) حدیث مذکور کی یہ تشریح دوسری تشریح کا تکملہ ہے۔

۴۔بعض معاصرین نے اس حدیث کے الفاظ میں اختلافات ہونے اور دیگر آیات واحادیث اور مقاصد شرع کے خلاف ہونے کے سبب اس کی تضعیف کی ہے۔(۳) فقیر ان کی رائے سے متفق نہیں ہے۔از روے درایت حدیث صحیح کی تضعیف اُس وقت ضروری ہوتی ہے جب مناسب تطبیق ممکن نہ ہو اور یہاں تطبیق ممکن ہے۔الغرض! کفر علتِ قتال نہیں ہے۔

اس سلسلے میں ایک اہم استدلال آیت کریمہ وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴿۳۹﴾ (انفال) سے کیا جاتا ہے۔اِس پر تفصیلی گفتگو آگے آتی ہے۔

❁❁❁

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، بَابُ مِنْ فَضَائِلِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ

(۲) احکام الاحکام شرح عمدۃ الاحکام، کتاب القصاص، حدیث: ۳۳۹:لا یحل دم امری مسلم اِلا باحدی ثلاث

(۳) جہاد اور روح جہاد/محمد عنایت اللہ اسد سبحانی،ص:۵۴

دوسرا سوال

کیا اسلام شوکت کفر کے خلاف جنگ چاہتا ہے؟

ایک دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کفر کے خلاف نہ سہی، اسلام میں شوکت کفر کے خلاف جنگ ضروری ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ کسی کے کفر کے خاتمہ کے لیے جنگ کا جواز ہو، البتہ! یہ ضرور ہے کہ روئے زمین پر شوکت واقتدار صرف اہل حق یعنی اہل اسلام کا حق ہے۔ دوسرے لوگوں کے پاس صرف دو آپشن ہیں، یا تو وہ اسلام قبول کریں، یا پھر اسلامی اقتدار کے ماتحت اوراس کے مطیع وفرماں بردار بن کر رہیں۔ برصغیر ہند میں اس نقطۂ نظر کے پرزور وکیل مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رہے ہیں۔ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ۝۲۹ (توبہ) کے تحت مولانا رقم طراز ہیں:

> ”یعنی لڑائی کی غایت یہ نہیں ہے کہ وہ ایمان لے آئیں اور دین حق کے پیرو بن جائیں، بلکہ اس کی غایت یہ ہے کہ ان کی خود مختاری و بالادستی ختم ہوجائے، وہ زمین میں حاکم اور صاحب امر بن کر نہ رہیں، بلکہ زمین کے نظام زندگی کی باگیں اور فرماں روائی وامامت کے اختیارات متبعین دین حق کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ ان کے ماتحت تابع ومطیع بن کر رہیں۔“ (تفہیم القرآن)

اس سلسلے میں ایک بات تو یہ سمجھنے کی ہے کہ ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادی حیثیت داعی کی ہے، جنگجو کی نہیں اور دعوت کا کام ہمیشہ حکمت، موعظت حسنہ اور علمی استدلال سے ہوگا (النحل: ۱۲۵)، جنگ سے نہیں ہوگا۔ البتہ! چوں کہ آزادی فکر اور آزادی اظہار رائے انسان کے بنیادی حقوق میں شامل ہیں، اس لیے آزادیِ دعوت کی راہ میں رکاوٹوں کے خاتمہ کے

لیے جنگ ضرور معقول ہے، لیکن دعوت کا آغاز جنگ سے ہو، یہ قطعاً غیر معقول ہے۔ اسی طرح کوئی ملک آزادی ضمیر اور آزادی دین پر جبر نہ کرتا ہو اور ظلم و جبر کے بجائے، عدل و انصاف پر قائم ہو تو اس کے ساتھ بھی جنگ کرنا ایک غیر معقول عمل ہے۔ سارے انبیا کا یہی طریق کار رہا ہے کہ اُنھوں نے غیر مسلم ریاستوں کے خلاف اعلان جنگ نہیں کیا، بلکہ اُنھیں رحمت و محبت اور نرمی و ملاطفت کے ساتھ حق کی دعوت دی۔ (طٰہٰ: ۴۳) اُنھوں نے دعوت کے لیے جنگ نہیں کی، بلکہ ظالموں سے پیغام حق کی اور اپنی یا دوسرے مظلوموں کی حفاظت کے لیے جنگ کی۔

اس تعلق سے یہ خیال بھی نہیں کیا جاسکتا کہ انبیاے سابقین حالت ضعف میں تھے، اس لیے انہوں نے شوکت کفر کے خلاف جنگ نہیں کی، اس لیے کہ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام جیسے اولوالعزم انبیا بڑی شوکت و اقتدار کے مالک تھے، لیکن انہوں نے بھی ظلم کے خلاف جنگ کی، کفر یا شوکت کفر کے خلاف جنگ نہیں کی۔ سورۂ بقرہ آیت ۲۴۶ تا ۲۵۲ میں اس جنگ کا ذکر ہے جس میں حضرت داؤد نے طالوت کی قیادت میں حصہ لیا تھا اور ایک عظیم جنگجو جالوت کو قتل کیا تھا۔ وہاں بھی اس بات کی صراحت ہے کہ اس جنگ کے پس پشت محرک بنی اسرائیل کی مظلومی و مقہوری سے نجات تھی۔

اس سلسلے میں دوسری بات یہ ہے کہ اگر مذکورہ بالا نظریے کو تسلیم کرلیا جائے، تو لازمی طور پر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلام ریاست کے معاملے میں آزادی اور انصاف کے خلاف ہے اور وہ ایسی ریاستوں کے خلاف بھی جنگ کا داعی ہے جو اپنے حدود میں آزادی ضمیر اور قیام انصاف پر استوار ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ اشکال اپنے آپ میں اتنا بڑا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے اسلام کی صداقت اور دعوت کے حوالے سے جدید ذہن کی تفہیم ممکن نہیں ہے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ جو ریاستیں مسلم ریاستوں سے صلح پر آمادہ ہوں، ان کے ساتھ جنگ کی ممانعت اور صلح کا معاہدہ شرعی اعتبار سے واجب ہے۔

اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦١﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ﴿٦٢﴾ (انفال) اگر غیر مسلم صلح کے لیے تیار ہوں تو تم بھی اس کے لیے تیار ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو، وہ ہر چیز سنتا جانتا ہے۔ اگر اُس سے اُن کا منشا تمھیں دھوکہ دینا ہو تو اللہ تمہارے لیے کافی ہے۔

اب قرآن کے اس واضح حکم کے ہوتے ہوئے بھلا کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں جنگ کا مقصد یہ ہے کہ کفار'' کی خود مختاری و بالا دستی ختم ہو جائے اور وہ زمین میں حاکم اور صاحب امر بن کر نہ رہیں۔'' یہاں تو یہ کہا جا رہا ہے کہ اس کا بھی اندیشہ نہ کرو کہ وہ تم کو دھوکہ دینے کے لیے صلح کر رہے ہیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھو، وہ تمہارے لیے کافی ہے۔

واضح رہے کہ یہ حکم ابتدائے اسلام اور ضعف مسلمین کے عہد کا نہیں ہے، بلکہ یہ جنگ بدر کے بعد کی آیات ہیں۔ ان میں تفصیل کے ساتھ مشرکین مکہ کے خلاف جنگ کی ترغیب دی گئی ہے، ان کے نقض عہد پر اُنھیں سزا دینے کو کہا گیا ہے، جن قبائل سے نقض عہد کا واقعی خطرہ ہو، ان سے ڈرنے کے بجائے ان کے سابقہ عہد کو اعلانیہ توڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے خلاف اپنا مضبوط لشکر و سپاہ اور اسباب جنگ تیار کرنے اور ان کے سینوں پر اپنی ہیبت کی دھاک بٹھانے کا حکم ہوا ہے۔ لیکن اس قوت و شوکت اور ہیبت و اقتدار کے باوجود یہ بھی کہا گیا کہ ایسی صورت میں بھی یہ لوگ اگر صلح و مصالحت کے لیے تیار ہوں تو اُنھیں یہ موقع دیا جائے اور صرف احتمال غدر کی بنیاد پر مصالحت سے پیچھے نہ رہا جائے۔ (سورۂ انفال: ۵۵-۶۱)

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ سورہ توبہ (آیت: ۲۹) میں اہل کتاب سے جنگ کرنے اور جب تک وہ جزیہ نہ ادا کر دیں اس وقت تک ان سے جنگ کرتے رہنے کا جو حکم ہے، وہ عام نہیں ہے، بلکہ یہ حکم ان اہل کتاب کے ساتھ خاص ہے جو اپنے شر و فساد اور فتنہ سامانی کے ذریعے اسلام اور اسلامی ریاست کے خلاف برسر پیکار ہوں۔ لہٰذا اس حکم سے وہ تمام غیر مسلم ریاستیں مستثنیٰ ہوں گی جو مسلم ریاست کے ساتھ صلح و معاہدے کے لیے تیار ہوں اور اپنے حدود میں اپنی آزاد و خود مختار اور منصفانہ نظام حکومت قائم رکھیں۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ مصالحت کا حکم صرف حالت ضعف سے خاص نہیں، بلکہ قوت و اقتدار کے زمانے میں بھی یہی حکم ہے۔ اسی طرح مصالحت کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ یہ صرف اسی وقت ہوگی جب کہ فریق ثانی جزیہ یا ٹیکس ادا کرے، بلکہ مطلق امن و سلام کے لیے مصالحت بھی اس ضمن میں شامل ہے۔

اب مطلع صاف ہو گیا کہ اسلام میں جنگ کا حکم کفر یا شوکت کفر کے خاتمہ کے لیے نہیں، بلکہ محض دفع فساد اور قیام عدل کے لیے ہے۔

❁❁❁

تیسرا سوال

فتنہ اور ازالۂ فتنہ کی حقیقت کیا ہے؟

کفر اور شوکت کفر کے خلاف جنگ کے جواز میں بعض اہل نظر اس آیت کریمہ کو شد و مد سے پیش کرتے ہیں:

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۝۱۹۳ (بقرہ)

ان سرکش لوگوں سے اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک کہ فتنے کا خاتمہ نہ ہو جائے اور دین، اللہ کے تابع نہ بن جائے۔

یہی مضمون سورۂ انفال میں یوں بیان ہوا:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۝۳۹ (انفال)

اُن سرکش لوگوں سے اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک کہ فتنے کا خاتمہ نہ ہو جائے اور کل دین، اللہ کے تابع نہ بن جائے۔

ان دونوں آیات میں فتنے کے خلاف جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ فتنے کو ختم کرنے کے لیے جنگ کرو تا کہ دین اللہ کا ہو جائے۔ سوال یہ ہے کہ یہاں فتنے سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کی مختلف تفسیریں موجود ہیں، جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ کفر و شرک

۲۔ شوکت کفر

۳۔ شرک اہل عرب

۴۔ شر و فساد

فتنہ کی پہلی تفسیر

اس سلسلے میں متقدمین میں علامہ ابوبکر جصاص حنفی (۳۷۰ھ(۱))اور علامہ شمس الدین قرطبی (۶۷۱ھ(۲))اور جدید علما میں اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی (۱۹۲۱ء(۳)) اور علامہ ابن باز (۱۹۹۹ء(۴)) کی آرا دیکھی جا سکتی ہیں۔تقریباً یہی تفسیر بہت سے مفسرین نے کی ہے، جو تسامح سے خالی نہیں۔

اس سے قبل یہ تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلام میں کفر کا خاتمہ جنگ کے جواز کا سبب نہیں بن سکتا۔اللہ کریم کا ارشاد ہے:لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۝۲۵۶ (بقرہ) دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۝۹۹ (یونس) کیا تم لوگوں کو مومن بنانے کے لیے مجبور کرو گے؟

فتنہ کی دوسری تفسیر

اس تفسیر کے سرگرم ترجمان عہد جدید میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹ء) ہیں۔ مولانا مودودی آیت مذکورہ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> ’’سیاق وسباق سے صاف ظاہر ہے کہ اس مقام پر ’’فتنے‘‘ سے مراد وہ حالت ہے جس میں دین اللہ کے بجائے کسی اور کے لیے ہو،اور لڑائی کا مقصد یہ ہے کہ یہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو۔پھر جب ہم لفظ ’’دین‘‘ کی تحقیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں دین کے معنی ’’اطاعت‘‘ کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد وہ نظام زندگی ہے جو کسی کو بالاتر مان کر اس کے احکام وقوانین کی پیروی میں اختیار کیا جائے۔پس دین کی اس تشریح سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ سوسائٹی کی وہ حالت، جس میں بندوں پر بندوں کی خدائی وفرماں روائی قائم ہو اور جس میں اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے، فتنے کی حالت ہے

---

(۱) احکام القرآن، البقرۃ: ۱۹۳

(۲) الجامع لاحکام القرآن، بقرۃ: ۱۹۳

(۳) رسالہ المحجۃ المؤتمنۃ فی آیۃ الممتحنۃ مشمولہ فتاویٰ رضویہ: ۱۱/ ۵۲۲، امام احمد رضا اکیڈمی، بریلی، ۲۰۱۶ء

(۴) مجموع فتاوی العلامہ عبدالعزیز بن باز: ۶/ ۲۲۳

اور اسلامی جنگ کا مطمح نظر یہ ہے کہ اس فتنے کی جگہ ایسی حالت قائم ہو، جس میں بندے صرف قانون الٰہی کے مطیع بن کر رہیں۔'' (تفہیم القرآن)

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات کے آخر میں مولانا مودودی اپنی اس فکر کو اور بھی واضح انداز میں بیان کرتے ہیں۔ مذکورہ آیت کے ضمن میں رقم طراز ہیں:

''دین اسلام کے پیروؤں کو حکم دیا گیا ہے کہ دنیا سے لڑو اور اس وقت تک دم نہ لو جب تک فتنہ یعنی ان نظامات کا وجود دنیا سے مٹ نہ جائے جن کی بنیاد خدا سے بغاوت پر قائم ہے اور پورا نظام اطاعت و بندگی اللہ کے لیے خالص نہ ہو جائے۔''

(ص:۱۳۵)

فتنہ کی تیسری تفسیر

یہ تفسیر بھی مختلف مفسرین کے یہاں پائی جاتی ہے۔ علامہ محمود آلوسی (۱۸۵۴ء) لکھتے ہیں:

وَالْمُرَادُ مِنَ الْفِتْنَةِ الشِّرْكُ عَلٰى مَا هُوَ الْمَأْثُوْرُ عَنْ قَتَادَةَ وَالسَّدِي وَغَيْرِهِمَا، وَ يُؤَيِّدُهُ أَنَّ مُشْرِكِي الْعَرَبِ لَيْسَ فِي حَقِّهِمْ إِلَّا الْإِسْلَامُ أَو السَّيْفُ لِقَوْلِهٖ سُبْحَانَهٗ تُقَاتِلُوْنَهُمْ أَوْ يُسْلِمُوْنَ ﴿۱۶﴾ (فتح)

یہاں فتنہ سے مراد شرک ہے، جیسا کہ یہی حضرت قتادہ اور سدی وغیرہ سے منقول ہے۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ مشرکین عرب کے سامنے اسلام یا تلوار میں سے کوئی ایک ہی آپشن تھا۔ اس کی دلیل اللہ پاک کا یہ ارشاد ہے: تم اُن سے جنگ کرو گے، اِلّا یہ کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ (روح المعانی، بقرۃ: ۱۹۳)

یہ تفسیر احناف، شوافع، حنابلہ، ظاہریہ، اباضیہ، امامیہ اور زیدیہ کے رجحانات کے مطابق ہے۔ مبسوط میں ہے:

لَا يُقْبَلُ مِنْ مُشْرِكِي الْعَرَبِ إِلَّا السَّيْفَ أَوِ الْإِسْلَامَ۔ (مشرکین عرب کے سامنے دو میں سے کوئی ایک ہی آپشن تھا، تلوار یا پھر اِسلام) اس کی وجہ یہ بتائی گئی: فَإِنَّهُمْ قَرَابَةُ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَالْقُرْآنُ نَزَلَ بِلُغَتِهِمْ، وَلَمْ يُرَاعُوا حَقَّ ذٰلِكَ حِينَ أَشْرَكُوا (مشرکین عرب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

بہت قریب تھے۔ قرآن اُنھیں کی زبان میں نازل ہوا اور شرک پر قائم رہ کر اُنھوں نے اس کی کچھ بھی رعایت نہیں کی۔ (باب المرتدین) فَالْمُعْجِزَةُ فِي حَقِّهِمْ أَظْهَرُ۔ (اسلام کی حقانیت اُن پر بالکل واضح تھی۔ الهداية، باب الجزية)

جدید عہد میں اس فکر کے سرگرم ترجمان مولانا وحید الدین خان اور جناب جاوید احمد غامدی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مولانا وحید الدین خان، مولانا مودودی کی مذکورہ بالا تفسیر کے سخت نقاد ہیں۔ اُنھوں نے مختلف مقامات پر اس فکر کو سختی سے مسترد کر دیا ہے۔ رقم طراز ہیں:

''آیت (بقرہ: ۱۹۱-۱۹۳ / انفال: ۳۸-۳۹) کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عقیدہ کو چھیڑے بغیر محض اس قسم کا ایک دنیوی نظام قائم کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے، جو اُوپر کی تشریح میں مذکور ہے، بلکہ یہاں عقیدہ ہی کو بدلنے کے لیے جنگ کرنے کا حکم ہے۔ آیت کے الفاظ کے مطابق کفار جس ''فتنہ'' میں مبتلا ہیں اور جس کی بنا پر اُن سے جنگ کا حکم دیا جا رہا ہے، اس سے اگر وہ باز آجائیں تو اُن کی ''مغفرت'' کردی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ مغفرت محض سیاسی اقتدار چھوڑنے یا فساد دنیا سے باز آجانے کا صلہ نہیں ہے، بلکہ وہ صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو کفر و شرک کو چھوڑ دیں۔'' (تعبیر کی غلطی، ص: ۲۲۶)

البقرۃ، آیت: ۱۹۳ر کے ذیل میں مولانا رقم طراز ہیں:

''عرب کے مشرکین اتمام حجت کے باوجود دعوت رسالت سے انکار کر کے اپنے لیے زندگی کا حق کھو چکے تھے۔ نیز انہوں نے جارحیت کا آغاز کر کے اپنے خلاف فوجی اقدام کو درست ثابت کر دیا تھا۔ اس بنا پر ان کے خلاف تلوار اٹھانے کا حکم ہوا۔ ''اور اُن سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے'' کا مطلب یہ ہے کہ سرزمین عرب سے شرک کا خاتمہ ہو جائے اور دین توحید کے سوا کوئی دین وہاں باقی نہ رہے۔ اس حکم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے عرب کو توحید کا دائمی مرکز بنا دیا۔'' (تذکیر القرآن، البقرۃ: ۱۹۳)

غامدی صاحب کی بھی یہی رائے ہے۔ چناں چہ البقرۃ: ۱۹۳ر کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

''اور تم یہ جنگ ان سے برابر کیے جاؤ، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین (اس سرزمین میں) اللہ ہی کا ہو جائے۔'' (البیان)

غامدی صاحب نے اس کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہاں جو جنگ کا حکم دیا گیا ہے اس کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ حج کے دوران قریش اپنی مزاحمت سے باز آجائیں، بلکہ درحقیقت اس کی انتہا فتنے کا ازالہ ہے اور یہ ازالہ دو طرح سے ہوتا ہے ایک مذہب کے سبب ظلم persecution کے خاتمہ سے اور دوسرا جن پر پیغمبر کی جانب سے اتمام حجت ہو چکا ہے اور اُنھوں نے حق کو قبول نہیں کیا ہے، اُن کے خاتمے کے ذریعے، خواہ آسمانی مصائب کے ذریعے ہو یا پیغمبر اور اس کے اصحاب کی تلوار سے ہو۔ غامدی صاحب نے لکھا ہے کہ جنگ کی پہلی صورت اپنی مذکورہ علت کے ساتھ قیامت تک فرض ہے، یعنی جب بھی مذہب کے نام پر روئے زمین پر کسی مذہبی گروپ کے ساتھ persecution ہوتا ہے، بااقتدار مسلم حکومت پر اُس کے ازالے کے لیے جنگ فرض ہوگی اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ لیکن جنگ کی دوسری صورت اُن اہل عرب کے ساتھ خاص تھی جن پر پیغمبر علیہ السلام کے ذریعے اتمام حجت ہو گیا تھا۔ آپ اور آپ کے اصحاب نے یہ کام اہل کتاب کے ساتھ جزئیہ کے آپشن کے ساتھ کیا، جب کہ مشرکین کے لیے صرف دو ہی آپشن تھے، اسلام یا تلوار۔

یہ ایسا فلسفہ ہے جس کی عقلی تفہیم و تشریح ممکن نہیں اور اُس پر اُٹھنے والے سوالات کا جواب نہ مولانا وحید الدین خان کے پاس ہے اور نہ غامدی صاحب کے پاس اور ان حضرات کو اس کا ٹھیک ٹھیک احساس بھی ہے۔ چناں چہ اس بیانیے کے آخر میں غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''یہ خدا کا کام تھا جو اِنسانوں کے ہاتھ انجام پایا۔ اسے ایک سنت الٰہیہ کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ انسانی اخلاقیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ سورۂ توبہ (۹) کی آیت: ۱۴ر کے الفاظ یُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ بِأَيۡدِيكُمۡ میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔''

اسی طرح مولانا وحید الدین خان ''تعبیر کی غلطی'' میں اس پر سوالات اٹھانے والے غیر مسلم ناقدین کی تفہیم کی کوشش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''درحقیقت [مشرکین عرب کے لیے قتل کا حکم] یہ اشاعت اسلام کی جدوجہد نہیں، بلکہ منکرین رسالت کے اوپر اس خدائی فیصلہ کا ظہور تھا جس کو قرآن میں امر اللہ، حکم

اللہ، وعداللہ وغیرہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور جو احقاق حق اور ابطال باطل کے لیے ہوتا ہے۔ یہ اپنی اصل نوعیت کے اعتبار سے اسلام کے اصولوں کو منوانے کی کوشش نہیں تھی، بلکہ حقیقتاً اسلام کے اصولوں کو نہ ماننے کی سزا تھی، جو زمین وآسمان کے مالک کی طرف سے ایک مخصوص شکل میں اُن کے اوپر نافذ کی گئی تھی۔'' (ص:۲۳۰)

فتنہ کی چوتھی تفسیر

یہ وہی تفسیر ہے جسے شروع میں اسلام میں جنگ کے جواز کی درست بنیاد قرار دیا گیا ہے، یعنی شر وفساد کا خاتمہ۔ اس تفسیر کے قائلین فتنہ کو اُس کے عمومی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے مطابق روئے زمین پر قائم ہر عدل وانصاف کی تائید اور ظلم وفساد کا ازالہ ضروری ہے اور اگر اس کے لیے جنگ ناگزیر ہو تو جنگ بھی یقیناً کی جائے گی۔ لیکن اس فتنہ وفساد میں لوگوں کا ضمیر، فکر وعقیدہ اور مذہب شامل نہیں ہے۔ یعنی کفر وشرک کو فتنہ قرار دے کر کسی شخص یا کسی ریاست کے خلاف جنگ نہیں کی جاسکتی۔ یہ انسان کا ذاتی معاملہ ہے جو اُس کے اور اُس کے خدا کے بیچ ہے۔ ہاں! اگر اس کی مذہبی آزادی پر پابندی لگائی جاتی ہے تو وہ فتنہ ضرور ہے اور اس کا ازالہ ضروری ہے، خواہ اس کے لیے جنگ ہی کرنی پڑے، اور جہاں تک کفر وشرک کے شر کا معاملہ ہے تو اُس کی سزا حق تعالیٰ کے حوالے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان وکفر اور حق وباطل کو واضح کر دیا ہے اور بندے کو ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی آزادی دی ہے۔ بندہ اگر ایمان کا راستہ اختیار کرتا ہے تو آخرت میں اس کی منزل جنت ہوگی اور کفر وشرک کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کا انجام جہنم ہوگا۔ لیکن یہ کسی انسان کا حق نہیں کہ کسی کو زبردستی مسلمان بنائے اور دینی معاملے میں جبر و اِکراہ کا معاملہ کرے۔ ایسا جبر واکراہ نہ جائز ہے اور نہ ایسا ایمان فی الواقع معتبر اور مفید ہے۔ پھر ایسا جبر، تکلیف شرعی کے فلسفے کو ساقط کر دیتا ہے جو انسانی حریت اور اختیار پر قائم ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سے پہلی والی آیت (بقرہ: ۱۹۲) میں بھی لفظ ''فتنہ'' مذکور ہے، جس کی تفسیر خود مولانا مودودی اور جناب جاوید احمد غامدی نے اس مقام پر تقریباً اسی مفہوم میں کی ہے اور انگریزی کے لفظ persecution کو اُس کا متبادل قرار دیا ہے۔ لیکن آیت نمبر: ۱۹۳ر میں مذکور الفاظ وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ کو بنیاد بنا کر مولانا مودودی

نے قیامت تک شوکت اسلام کے قیام اور غیر اِسلامی نظاموں کے اِنہدام کے لیے جنگ کو فرض قرار دے دیا ہے، جب کہ غامدی صاحب نے اتمام حجت کے فلسفے کے ساتھ اس جنگ کو مشرکین عرب کے خاتمے اور اُس عہد کے اہل کتاب کی زیر دستی تک منحصر رکھا ہے۔

فتنہ کی یہ چوتھی تفسیر لفظ فتنہ کے اپنے اصل معنی، شریعت اسلامی کی اخلاقیات، قرآن کے فلسفۂ عدم اکراہ، احادیث صحیحہ، سیرت طیبہ، امام مالک، امام اوزاعی، امام ثوری، فقہاے شام، شیخ ابن تیمیہ، ابن قیم اور قاضی شوکانی کی تحقیق اور زمانی تفہیم کے مطابق ہے اور یہی تفسیر راقم السطور کے نزدیک راجح بلکہ درست ہے۔ فقہی اصول ضرورت کی روشنی میں بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ معاصر احناف وشوافع کو امام مالک اور امام اوزاعی کی رائے قبول کر لینی چاہیے۔

اسلامی اخلاقیات اور قرآنی فلسفۂ عدم اکراہ کا ذکر شروع میں آچکا ہے۔ دیگر حوالے یہاں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ محدث عبدالرزاق امام زہری سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عروہ سے روایت ہے کہ جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی اور ایمان ظاہر ہوگیا تو کفار قریش اپنے قبائل کے مسلمانوں کو قید وعذاب سے گزارنے لگے اور انہوں نے ان نئے مسلمانوں کو ان کے دین سے روک دینے کا پروگرام بنایا۔(يُعَذِّبُونَهُمْ وَيَسْجِنُونَهُمْ، وَأَرَادُوا فِتْنَتَهُمْ عَنْ دِينِهِمْ) عروہ کہتے ہیں کہ ہمیں خبر پہنچی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت اہل ایمان سے فرمایا: زمین میں بکھر جاؤ۔ مسلمانوں نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! ہم کہاں جائیں؟ آپ نے فرمایا: یہاں۔ اور اپنے ہاتھوں سے سرزمین حبشہ کی طرف اشارہ فرمایا۔(۱)

اس روایت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ فتنہ اہل ایمان کے لیے ایسی گھیرا بندی ہے، جس میں آزادی رائے محفوظ نہ ہو اور اپنی آزادی سے دین قبول کرنے پر ایسی سخت سزاؤں سے گزرنا پڑے، جس کے بعد موت یا ہجرت ہا کا راستہ بچتا ہے۔ اس سے آیت کریمہ: وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۱۹۳ (بقرہ) کا معنی

---

(۱) مصنف عبدالرزاق، كِتَابُ الْمَغَازِي، مَنْ هَاجَرَ إِلَى الْحَبَشَةِ

واضح ہوجاتا ہے۔یعنی اب اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان سرکش کفار سے اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک کہ دین کی راہ میں رکاوٹوں اور قید و بند کا خاتمہ نہ ہوجائے اور مذہبی آزادی حاصل نہ ہوجائے۔

۲۔حضرت عبداللہ بن زبیر کے عہد میں جب مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں کے خلاف نکل چکی تھیں اور اُس وقت حضرت عبداللہ بن عمر غیر جانب دار خاموش تھے۔ایک شخص آیا اور اُن سے بحث کرنے لگا۔دوران بحث اس نے فتنہ والی یہ آیت بھی پیش کی۔ اس کے جواب میں حضرت ابن عمر نے فرمایا:

> ہم نے دفع فتنہ کے لیے عہد رسالت میں جنگ کی۔اس وقت اسلام قلت میں تھا۔اس وقت انسان اپنے دین کے معاملے میں فتنوں سے دوچار تھا۔اس کے دین کی وجہ سے اس کے دشمن اُسے قتل وقید کرتے تھے۔بالآخر اِسلام کثرت میں آگیا۔اب کوئی فتنہ باقی ہی نہیں رہا۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عمر کے نزدیک فتنہ سے مراد مذہبی تشدد (*religious persecution*) ہے۔

۳۔امام مسلم نے حضرت بریدہ سے ایک طویل روایت نقل کی ہے، جس کا ایک حصہ یہ بھی ہے:

> وَإِذَا لَقِيتَ عَدُوَّكَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، فَادْعُهُمْ إِلٰى ثَلَاثِ خِصَالٍ أَوْ خِلَالٍ فَأَيَّتُهُنَّ مَا أَجَابُوْكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ۔
>
> جب مشرک دشمنوں سے ملو تو اُنھیں تین باتوں کی دعوت دو اور وہ ان میں سے کسی بھی بات کے لیے تیار ہوجائیں تو تم بھی اس کے لیے راضی ہوجاؤ۔

اسی حدیث میں آگے ہے:

> فَإِنْ هُمْ أَبَوْا فَسَلْهُمُ الْجِزْيَةَ، فَإِنْ هُمْ أَجَابُوْكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ، وَكُفَّ عَنْهُمْ، فَإِنْ هُمْ أَبَوْا فَاسْتَعِنْ بِاللهِ وَقَاتِلْهُمْ۔(۲)

---

(۱) صحیح بخاری، باب کتاب تفسیر القرآن، وقاتلوہم حتی لاتکون فتنۃ

(۲) صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسير، باب تامير الامامِ الامراء على البعوث

اور اگر وہ اسلام کے لیے تیار نہ ہوں تو اُن سے جزیہ کا مطالبہ کرو۔ اگر وہ جزیہ دیں تو قبول کرو اور انہیں کوئی ضرر نہ پہنچاؤ اور اگر وہ جزیہ دینے سے بھی انکار کریں تو اَب اُن سے جنگ کرو۔

اس حدیث صحیح سے صاف واضح ہوتا ہے کہ مسلم ریاست کے غیر مسلم شہری اگر ٹیکس ادا کرتے ہیں تو ان سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جائے گا اور اگر مسلم ہوتے ہوئے بھی اس سے انکار کرتے ہیں تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی، جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مانعین زکات کے بارے میں فرمایا تھا۔(۱) مذکورہ حدیث سے یہ بات بھی آفتاب نیم روز کی طرح روشن ہوئی کہ کفر وشرک کے خاتمے کے لیے جنگ نہیں کی جاسکتی اور نہ فتنے کی تفسیر، کفر وشرک سے کرنا درست ہے۔

۴۔ جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا تو اس وقت اُن کو پورا اِقتدار حاصل تھا اور مشرکین قریش کی گردنیں آپ کے سامنے جھکی ہوئی تھیں۔ لیکن اس دن آپ نے کسی مشرک کو اس کے شرک کی وجہ سے قتل نہیں کیا، نہ یہ اعلان کیا کہ آج جو مشرک اسلام نہیں لائے گا اُسے قتل کردیا جائے گا۔ اس کے برعکس آپ نے یہ فرمایا:

اے گروہ قریش! اللہ کریم نے تمہارے اندر سے جاہلیت کی نخوت اور نسبی تفاخر کو ختم کردیا۔ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

اس کے بعد یہ پوری آیت تلاوت فرمائی:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات:۱۳)

اے انسانو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہیں مختلف کنبوں اور قبیلوں میں تقسیم کردیا، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ ہے جو سب سے بڑا متقی ہو۔

---

(۱) وَاللّٰهِ لَوْ مَنَعُونِي عِقَالًا كَانُوا يؤدُّونه إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَاتَلْتُهُمْ عَلَى مَنْعِهِ.
بخدا اگر وہ اس رسی کو دینے سے بھی انکار کریں جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے تو ضرور میں ان سے جنگ کروں گا۔(صحیح البخاري، ح:۶۸۵۵)

اس کے بعد دریافت فرمایا: اے گروہ قریش! میں تمہارے بارے میں کیا کرنے والا ہوں۔ اِس سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ قریش نے کہا: ہم اچھا ہی گمان رکھتے ہیں، کیوں کہ آپ کریم ابن کریم ہیں۔ فرمایا:

جاؤ،تم سب آزاد ہو۔ (سیرت ابن ہشام: ۵ / ۷۴)

بعد میں بھی سیرت نبوی کے اندر کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو صرف اس لیے قتل کیا ہو کہ وہ کافر یا مشرک تھا، وہ عرب یا مکہ ہی کا کیوں نہ ہو۔

اس پوری بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آیات کریمہ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴿۱۹۳﴾ (بقرہ) اور وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴿۳۹﴾ (انفال) میں جس فتنے کے استیصال کے لیے جنگ ضروری قرار دی گئی ہے اس سے مراد روئے زمین سے شر وفساد اور ظلم و بربریت کا خاتمہ ہے۔

یہ سچ ہے کہ بعض مفسرین نے فتنہ کی تفسیر میں کفر وشرک، شوکت کفر یا شرک اہل عرب کا بھی قول کیا ہے، لیکن فی الواقع یہ تفاسیر، عقل ونقل، کتاب وسنت، اصول دین اور مقاصد شرع کے پیش نظر نادرست ہیں۔ فتنہ کی چوتھی تفسیر ''شر وفساد'' ہی کتاب وسنت، مقاصد دین اور اصول شریعت کے لحاظ سے درست تفسیر ہے۔ هذا ما ظهر لي والله أعلم۔

چوتھا سوال

کیا آیت سیف، آیات امن کے لیے ناسخ ہے؟

یہاں ایک بہت ہی اہم سوال رہ جاتا ہے اور وہ یہ دعویٰ ہے:

''رحمت عامہ، آزادی مذہب اور مصالحت کی آیات، آیات جنگ وقتال سے منسوخ ہیں۔''

اس قسم کے دعوے کے ذریعے بعض بڑوں نے بھی اسلام کے فلسفۂ جنگ کو اُلجھاؤ کا شکار بنا دیا ہے۔ دوسری طرف بعض اسلام دشمن اور شر پسند عناصر نے یہاں تک کہہ دیا کہ دراصل کتاب اللہ میں دو طرح کی آیات ہیں، کچھ جنگ اور تشدد پر آمادہ کرتی ہیں تو کچھ امن وسلامتی اور عفو ورحمت پر۔ اس لیے اسلام کو اَمن وامان اور عفو ورحمت کا دین ثابت رکھنے کے لیے دوسری قسم کی آیات کو قرآن سے نکال دیا جائے۔ العیاذ باللہ!

حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں آیات قرآنیہ کے اندر کوئی تناقض یا تضاد ہے ہی نہیں، جس کو دفع کرنے کے لیے نسخ یا نعوذ باللہ حذف کی ضرورت ہو۔ اسلام کے عام احکام حریت، مصالحت، عفو ودرگزر اور اَمن وسلامتی پر مشتمل ہیں، جب کہ جنگ اور تشدد کے احکام ضرورت اور مجبوری کے ہیں۔ اسلام میں جنگ کی اجازت بس اسی وقت ہے جب کہ انسان کے جسم یا ضمیر پر جبر اور ظلم کے پہرے ہوں۔ ایسے ماحول میں قیام انصاف اور خاتمۂ فساد کے لیے اسلام جنگ کا حکم دیتا ہے۔ لیکن اس وقت بھی یہ حکم مطلق نہیں کہ جب جو چاہے ہتھیار اٹھالے اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے بلکہ اس وقت بھی یہ بہت سے قانونی اور اخلاقی شرائط کے ساتھ مشروط ہے، جن میں سرفہرست قدرت

واستطاعت، نظم اجتماعی، اسلامی ریاست اور اُس کے حاکم کا وجود اور اُس کی اجازت و قیادت واطاعت ہے۔

اس تفصیل سے یہ سوال بھی عبث ہوجاتا ہے کہ کیا اسلام میں صرف دفاعی جنگ جائز ہے، یا دفاعی کے ساتھ اقدامی جنگ کا بھی جواز ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ قرآن پاک میں لفظ سیف وارد نہیں ہے، البتہ! بیشتر مفسرین نے سورۂ توبہ کی آیت نمبر: ۵ رکو-اور بعض نے سورۂ توبہ کی بعض دیگر آیات کو-آیت سیف کا عنوان دیا ہے اور اُسے مشرکین کے حوالے سے رواداری اور لطف وکرم کے سابقہ احکام کے لیے ناسخ قرار دیا ہے۔سورۂ توبہ کی آیت نمبر:۵ ریہ ہے:

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵ (توبہ)

جب حرمت کے مہینے گزر جائیں تو جہاں پاؤ اُن مشرکین کو قتل کرو، اُنھیں پکڑو، گھیرو اور اُن کے لیے گھات لگاؤ، البتہ! اگر وہ توبہ کرلیں، نماز قائم کرلیں، زکات ادا کردیں، تو اُنھیں چھوڑ دو، بےشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت کو بہت سارے مفسرین نے عدل وانصاف، رحم وتلطف، جنگی اصول اور پُرامن دعوت واصلاح کے مضامین پر مشتمل سیکڑوں آیات قرآنیہ کے لیے ناسخ قرار دے دیا ہے۔ بقول علامہ یوسف القرضاوی صورت حال یہاں تک پہنچ گئی کہ گویا آیت سیف خود ہی آیات قرآنیہ کی گردن پر چلنے والی تلوار بن گئی۔

كَأَنَّمَا أَصْبَحَتْ اٰيَةُ السَّيْفِ نَفْسُهَا سَيْفًا يَقْطَعُ رِقَابَ الْاٰيَاتِ۔ (۱)

یہاں دو باتیں قابل غور ہیں:

۱-مسئلۂ نسخ کی نزاکت

۲-اور آیت سیف کی تفہیم۔

---

(۱) فقہ الجہاد، ص:۲۸۶، باب ثالث، فصل رابع: آیۃ السیف

مسئلۂ نسخ

نسخ کی بحث، علوم قرآن کی ایک انتہائی دقیق اور پیچیدہ بحث ہے اور کسی آیت کے ناسخ یا منسوخ ہونے کا دعویٰ اس سے بھی زیادہ مشکل اور دشوار۔ مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۷۶۲ء) ناسخ ومنسوخ کے زیر عنوان رقم طراز ہیں:

''ناسخ ومنسوخ کی معرفت فن تفسیر کے مشکل مقامات سے ہے، جن کے بہت سے مباحث اور ان کے اندر بے شمار اختلافات ہیں۔ اس مشکل اور دشواری کی سب سے بڑی وجہ متقدمین ومتأخرین کی اصطلاحات کا اختلاف ہے۔۔۔ متأخرین کی اصطلاح کے مطابق منسوخ آیات کی تعداد بہت کم ہے، بالخصوص اس توجیہ کی روشنی میں جو ہم نے بیان کی ہے۔''(۱)

شاہ صاحب نے علامہ سیوطی کی ذکر کردہ ۲۱/آیات کو اپنے نقد وتبصرے کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

''شیخ ابن العربی کی موافقت میں علامہ جلال الدین سیوطی نے فرمایا کہ یہ اکیس (۲۱) آیتیں منسوخ ہیں، جن میں سے بعض کے نسخ پر اختلاف بھی ہے۔ ان کے علاوہ دیگر آیات کے منسوخ ہونے کا دعویٰ صحیح نہیں... اور ہماری تحقیق کردہ تحقیق کے مطابق صرف پانچ (۵) آیات منسوخ ہیں۔'' (حوالہ سابق، ص:۵۵)

شاہ صاحب کی اِس تحریر سے چند باتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) آیت قرآنیہ کی روشنی میں کتاب مبین میں نسخ کے وجود پر اُمت کا اجماع ہے۔ البتہ! اس کی تفصیلات وتشریحات میں بے شمار اختلافات موجود ہیں۔

(۲) نسخ کے وسیع مفہوم کے سبب متقدمین کے یہاں منسوخ آیات کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔ اس کے برخلاف متأخرین نے اپنا میزانیہ سخت کیا، یہاں تک کہ علامہ جلال الدین سیوطی کے نزدیک یہ تعداد ۲۱/ میں سمٹ گئی، جس پر شاہ صاحب نے جب غور کیا تو یہ تعداد اور سمٹ کر پانچ بچ گئی۔

---

(۱) الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص: ۴۸-۴۹، مجلس برکات، مبارک پور، ۲۰۱۲ء

(۳) اس کے معنی یہ ہوئے کہ متأخرین کے یہاں وہ بہت سی آیتیں معمول بہا ہوسکتی ہیں جو متقدمین کے یہاں سرے سے منسوخ تھیں۔

شاہ ولی اللہ کے مطابق منسوخ آیات حسب ذیل ہیں:

۱- کُتِبَ عَلَیۡکُمۡ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ ﴿۱۸۰﴾ (بقرہ)

۲-اِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ عِشۡرُوۡنَ صٰبِرُوۡنَ یَغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ ﴿۶۵﴾ (انفال)

۳-لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنۡۢ بَعۡدُ ﴿۵۲﴾ (احزاب)

۴-یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نَاجَیۡتُمُ الرَّسُوۡلَ فَقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیۡ نَجۡوٰىکُمۡ صَدَقَةً ذٰلِکَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ وَ اَطۡهَرُ فَاِنۡ لَّمۡ تَجِدُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۲﴾ (مجادلہ)

۵-قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۲﴾ (مزمل)

مرشد گرامی فرماتے ہیں کہ نسخ کی ایک تقسیم نسخ موقّت اور نسخ موبّد میں بھی ہونی چاہیے۔ کبھی حکم دائمی طور پر ختم کر دیا جاتا ہے، جب کہ کبھی اسے صرف کسی خاص صورت حال میں روک دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ دائمی طور پر موقوف رہے۔(۱) اسی طرح نسخ کی صورت میں بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ وجوب منسوخ ہوتا ہے جس کے بعد بھی اس کا استحباب یا جواز باقی رہتا ہے۔ آیت سیف سے جن حضرات نے نسخ کا قول کیا ہے، ان کے قول کو اِس تناظر میں بھی سمجھنا چاہیے۔

آیت سیف کی تفہیم

اس تناظر میں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ وہ بہت سی آیتیں جن کو عام طور سے منسوخ سمجھا جاتا ہے، وہ غیر منسوخ، معمول یا موؤل ہیں۔ مثال کے طور پر آیت سیف کو ہی لے لیجیے۔ عام مفسرین کا خیال یہ ہے کہ آیت سلم (لَاۤ اِکۡرَاهَ فِی الدِّیۡنِ) آیت سیف (فَاقۡتُلُوۡهُمۡ حَیۡثُ وَجَدۡتُّمُوۡهُمۡ) سے منسوخ ہے۔ موجودہ زمانے میں لَاۤ اِکۡرَاهَ فِی الدِّیۡنِ اور لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ کے پیش نظر جب امن پسند حضرات آزادی مذہب کی بات کرتے ہیں، (وَقَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ وَلَا تَعۡتَدُوۡا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ

---

(۱) اس لیے کہ یہ حکم اپنی علت کے ساتھ دائر ہوگا، وجود علت سے وجود حکم کا تحقق ہوگا۔ الحکم یدور مع علته وجوداً وعدماً۔

الْمُعْتَدِيْنَ) کے پیش نظر صرف دفاعی جنگ یا ازالۂ فساد کے لیے جنگ کی بات کرتے ہیں تو بہت سے ذہنوں کو یہ وسوسہ گھیر لیتا ہے کہ اس قسم کی آیات تو آیت سیف سے منسوخ ہیں۔ شاہ ولی اللہ جیسے محققین کے نقطۂ نظر سے مسئلے پر غور کیجیے تو اِس قسم کے بہت سے شبہات از خود زائل ہوجاتے ہیں۔ مزید عرض ہے کہ:

ا۔ سورۂ توبہ کی آیت نمبر ایک میں معاہد مشرکین سے براءت ہے۔ آیت نمبر: ۲/ میں اس کے ساتھ اُنھیں چار مہینے کی مزید مہلت دی گئی ہے۔ تیسری آیت میں اسی بات کا واضح طور پر حج اکبر کے دن اعلان کا ذکر کیا گیا ہے۔ چوتھی آیت میں اس حکم سے ان معاہد مشرکین کا استثنا کیا گیا ہے، جو اب تک اپنے عہد و پیمان پر قائم ہیں، جس سے واضح ہوتا ہے کہ سابق حکم براءت صرف ان معاہدین سے ہے جو معاہدہ توڑ چکے ہیں یا اندرونی طور پر مسلمانوں کے خلاف سازش میں مبتلا ہیں۔ اس کے بعد پانچویں آیت ۔ جو آیت سیف ہے۔ میں ''المشرکین'' کے قتل و قید کی بات کی گئی ہے۔

اب آیت نمبر ۴/ کے استثنا سے جوڑ کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ آیت سیف کا حکم صرف ان مشرکین کے لیے ہے جنھوں نے اعلانیہ یا خفیہ طور پر معاہدے توڑ دیے ہیں۔ گویا عربی گرامر کے لحاظ سے یہاں ''المشرکین'' کا الف لام، استغراق کے لیے نہیں ہے، جس کی وجہ سے یہ حکم تمام مشرکین کو شامل ہوجائے، بلکہ یہاں الف لام عہد کے لیے ہے جس سے مراد وہ مخصوص و معہود مشرکین ہیں جنھوں نے عہد شکنی کی تھی۔ اس صورت میں نہ نسخ آیات کا مسئلہ درپیش ہے، نہ تاویل کا نہ عذر خواہی اور غیر ضروری صفائی کا۔ یہ تفسیر سیاق وسباق، مزاج دین، عقلیت عامہ اور مقاصد شریعت سے قریب اور واضح ہے، جس کی تائید مختلف مفسرین کے بیان سے بھی ہوتی ہے، مثلاً علامہ ابن جوزی نے زجاج کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ براءت ان معاہدین سے تھی جنھوں نے نقض عہد کا ارتکاب کیا تھا۔ لہٰذا جو نقض عہد کے مرتکب نہیں تھے، وہ اس براءت کے حکم میں شامل نہیں تھے۔(۱) بھلا باغیوں اور غداروں کے قتل و قید کو دنیا کا کون سا قانون غیر منصفانہ کہتا ہے؟

---

(۱)معنى الكلام: وقعت البراءة من المعاهدين الناقضين للعهود، إلا الذين عاهدتم ثم لم ينقضوكم، فليسوا داخلين في البراءة مالم ينقضوا العهد (زاد المسير في علم التفسير: ۲/۲۳۶)

۲۔خود آیت سیف میں بھی صرف قتل کا حکم نہیں ہے بلکہ قید اور دیگر سزاؤں کا آپشن بھی موجود ہے۔

۳۔آیت سیف کے بعد والی آیت میں ہے کہ اگر اب اس کے بعد کوئی مشرک امان طلب کرے تو اسے امان دیجیے، اب وہ قرآن سننے کے بعد اُسے قبول کرتا ہے تو بہتر ہے، بصورت دیگر اُسے محفوظ مقام تک پہنچا دیجیے۔(۱) اس سے بھی مذکورہ تفسیر کی تائید ہوتی ہے، کیوں کہ اس آیت سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ آیت سیف میں مذکور حکم تمام مشرکین کے لیے نہیں ہے اور یہ آیت، آیت سیف کے بعد ہے اور مزید یہ کہ بہت سے مفسرین نے اس کا حکم ثابت اور غیر منسوخ قرار دیا ہے۔(دیکھیے تفسیر طبری)

۴۔علامہ ابن جریر طبری کی تحقیق بھی یہی ہے کہ آیت سیف کے اندر تمام مشرکین کے قتل کا حکم نہیں ہے، بلکہ یہ حکم صرف باغیوں کے لیے ہے۔(تفسیر طبری، سورۂ توبہ:۶) اور آج بھی پوری دنیا کے قانون میں باغی کے قتل کا حکم موجود ہے۔

۵۔بہت سے مفسرین ایسے ہیں جو آیت سیف کو بلا استثنا تمام مشرکین پر منطبق مانتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی طرف سے یہ انطباق درست نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو سورۂ توبہ کے ساتھ اعلان براءت کے لیے بھیجا تھا تو آپ نے حضرت علی سے جو کچھ فرمایا تھا اُس میں یہ بھی تھا:

وَمَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَهْدٌ فَعَهْدُهُ إِلٰى مُدَّتِهِ.

جن کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ ہے اُن کا معاہدہ اُن کی مدت تک قائم رہے گا۔(سنن ترمذی، حدیث:۸۷۱)

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سورۂ براءت میں صرف انہی مشرکین کے معاہدوں کو کالعدم قرار دیا گیا جو اپنے معاہدے کے پابند نہیں تھے۔اس کی تائید مزید سورۂ براءت کی آیت ۷ رسے بھی ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جن مشرکین سے آپ نے مسجد حرام کے قریب معاہدہ کیا ہے ان کے ساتھ اپنے معاہدے کو اُس وقت تک باقی رکھیں جب تک وہ

---

(۱) وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَامَ اللهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ (التوبة:٦)

اس کے پابند رہیں۔(۱) اسی طرح جن کے معاہدے ختم کیے گئے ان کے اوصاف آیت نمبر: ۸ رمیں بیان کیے گئے ہیں کہ وہ صرف زبانی طور پر آپ کے ساتھ ہیں اُن کا دل نفاق، سازش اور عداوت سے بھر چکا ہے۔(۲)

بہر کیف! آیت سیف کو اخلاق، انصاف، حریت اور مساوات کی تمام آیت کے لیے ناسخ قرار دینا اور اُسے جبری مسلمان بنانے کے مفہوم میں لینا قطعاً درست نہیں ہے۔اس کی بڑی حد تک وضاحت تو خود آیت سیف کے معاً بعد والی آیت کریمہ سے ہوجاتی ہے۔ارشاد ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ۝ (توبہ)

اگر کوئی مشرک آپ سے امان مانگے تو آپ اُسے امان دے دیں، تا کہ وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر اُسے محفوظ مقام تک پہنچادیں، یہ حکم اس وجہ سے ہے کہ وہ ناواقف لوگ ہیں۔(۳)

آیت کے آخری حصے سے ایک بات صاف ہوجاتی ہے کہ جو لوگ پیغام اسلام سے واقف نہیں ہیں، ان سے ہمارا کام لڑنا نہیں، بلکہ ان تک اسلام کا پیغام پہنچانا ہے اور اس کے بعد بھی اسے قبول نہ کریں تو ہمارے لیے ان پر ظلم کرنا روا نہیں ہے، بلکہ ان کی حفاظت کرنا اور ان کو محفوظ مقامات تک پہنچانا ہمارا دینی فریضہ ہے۔

شیخ الازہر علامہ محمود شلتوت (۱۹۶۳ء) قائلین نسخ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان حضرات کا عجیب وغریب ارشاد یہ بھی ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت **وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ** آیت ماقبل **وَقَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ** کے لیے ناسخ ہے۔اسی طرح اسی سورہ کی آیت **وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ**

---

(۱) كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (التوبۃ:۷)

(۲) كَيْفَ وَإِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً يُرْضُونَكُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَى قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ (التوبۃ:۸)

(۳) تفصیل کے لیے دیکھیے یوسف القرضاوی کی فقہ الجہاد، جلد اول، فصل رابع: آیۃ السیف وما قیل: انہانسخت ۱۴۰ آیۃ

فِتْنَةٌ اپنے سے پہلی والی آیت وَلَا تُقَاتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقَاتِلُوْكُمْ فِيْهِ کے لیے ناسخ ہے۔اس طرح چار آیات پر مشتمل سورۂ بقرہ کے اس ایک ہی مقام پر یہ ہوا ہے کہ،قول نسخ کے سبب، ان میں سے دو آیات ناسخ ہوگئی ہیں اور دو منسوخ، دوسری نے پہلی کو اور چوتھی نے تیسری کو منسوخ کر دیا ہے۔امام رازی اپنی تفسیر میں اِس رائے پر تعلیق کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

يَبْعُدُ مِنَ الْحَكِيْمِ أَنْ يَجْمَعَ بَيْنَ آيَاتٍ مُتَوَالِيَةٍ تَكُوْنُ كُلُّ وَاحِدَةٍ مِّنْهَا نَاسِخَةً لِلْأُخْرىٰ (بقرہ:۱۹۱-۱۹۲)

ذاتِ سراپا حکمت سے یہ بعید ہے کہ ایک ساتھ ایسی آیات کو جمع فرمادے کہ ان میں سے ایک دوسری کے لیے ناسخ ہو۔

یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ نسخ کا یہی وہ تصور ہو جس نے مخالفین اسلام کے لیے قرآن میں تناقض وتضاد تلاش کرنے کی راہ ہموار کی ہو، کیوں کہ یہاں جس قسم کے نسخ کا قول محبان اسلام نے کیا ہے، اسے مخالفین اسلام قبول نہیں کر سکتے۔ پھر جب کہ بعض علماے اسلام ہی یہاں نسخ کے قائل نہیں تو ایسے میں مخالفین بھلا اسے کیسے قبول کر سکتے ہیں؟

اس کے برخلاف آیات قتال کی جو توجیہ ہم نے کی ہے، اس سے آپ کو محسوس ہوگا کہ ان آیات کے بیچ نہ کوئی تعارض ہے اور نہ کوئی تناقض ہے اور نہ ہی اس میں قول نسخ کی گنجائش ہے، کیوں کہ نسخ تو اس وقت ہوتا ہے جب آیات کے بیچ تعارض ہو۔'' (القرآن والقتال:۳۹،۴۰)

الغرض! آیت سیف کو آیات امن کے لیے ناسخ قرار دینے کے لیے نہ صرف یہ کہ کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے، بلکہ اس سے مقاصد قرآن اور حکمتِ صاحبِ قرآن پر بھی حرف آتا ہے۔العیاذ باللہ!

❁❁❁

پانچواں سوال

اللہ کے لیے کل دین ہونے کے کیا معنی ہیں؟

ازالۂ فتنہ کا دوسرا حصہ یہ ہے: ''اور پورا دین اللہ کا ہو جائے۔''

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ﴿۱۹۳﴾ (بقرہ) وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ﴿۳۹﴾ (انفال)

اُن سرکش لوگوں سے اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک کہ فتنے کا خاتمہ نہ ہو جائے اور کل دین، اللہ کے تابع نہ بن جائے۔

ان الفاظ سے بطور خاص کفر یا شوکت کفر کے خاتمہ کے لیے جنگ کی مشروعیت پر استدلال کیا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ استدلال نادرست ہے تو ان الفاظ کی درست تفسیر کیا ہے؟ دین کا کیا مفہوم ہے اور کل دین کا اللہ کے لیے ہو جانے کے کیا معنی ہیں؟

دین کے معنی عبادت اور اطاعت کے آتے ہیں۔ اسی معنی کو بنیاد بنا کر کسی نے آیت مذکورہ سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس وقت تک جنگ کی جائے گی جب تک کہ اسلام کے سوا تمام مذاہب کا خاتمہ نہ ہو جائے اور کسی نے یہ کہا ہے کہ اس وقت تک جنگ کی جائے گی جب تک کہ نظام اطاعت وحکومت صرف اسلام کا قائم نہ ہو جائے۔

یہ دونوں تفاسیر چند جوشیلے مسلمانوں کے جذبات کے لیے خواہ کتنی ہی appealing کیوں نہ ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تعلیمات اسلام، مقاصد شرع، اس آیت کا سیاق وسباق اور بے شمار آیات قرآنیہ قطعاً ان کے خلاف ہیں، نیز یہ تفاسیر غیر مسلم جذبات کے لیے انتہائی حد تک اشتعال انگیز ہیں۔

ان تمام اُمور کی موافقت اسی وقت ہوگی جب یہاں دین سے مراد اس کا متعارف مفہوم لیا جائے جو ''مذہب یا انسان کے نظام عقیدہ وعبادت'' سے عبارت ہے اور ''کل دین اللہ کے لیے ہوجائے'' کے معنی یہ ہوں کہ ''انسان کا مذہب وعقیدہ انسانوں کی مداخلت سے آزاد ہوجائے۔'' اِسے دوسرے لفظوں میں مذہبی آزادی کہا جاتا ہے جس کا بیان لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۱) اور لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (۲) میں ہوا ہے۔ چوں کہ مشیت ربانی ہی کچھ ایسی ہے کہ زمین پر مختلف نظامہائے فکر کی آزادی باقی رہنی چاہیے۔ (۳)

اس اجمال کی کسی قدر تفصیل کے لیے تفسیر المنار کا مطالعہ کرتے ہیں، جو مذکورہ بالا شبہے کے ازالے میں کافی معاون ہوگا۔ ان شاء اللہ۔ علامہ رشید رضا رقم طراز ہیں:

''وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ یعنی اے پیغمبر! اب تم اور تمہارے اہل ایمان اصحاب ان سے جنگ کریں، یہاں تک کہ دین کے معاملے میں persecution اور نوع بہ نوع اذیت ناکیوں کا خاتمہ ہوجائے، جیسا کہ کفار مکہ نے تمہارے خلاف مکہ میں اس وقت روا رکھا جب انھیں شوکت واقتدار حاصل تھا، یہاں تک کہ اُنھوں نے تمہارے دین کے سبب تمھیں مکہ سے نکال دیا، پھر اُنھوں نے تمہارے مقام ہجرت پر چڑھائی کردی۔ یہ جنگ اُن سے اُس وقت تک جاری رکھیں جب تک کہ کل دین اللہ کے لیے نہ ہوجائے، یعنی کوئی بھی شخص کسی بھی شخص کو اُس کے دین کے معاملے میں ابتلا وآزمائش میں نہ ڈال سکے، اس طور پر کہ کوئی کسی کو اپنا دین چھوڑنے اور دوسرے کا دین قبول کرنے پر مجبور نہ کرسکے، کہ وہ دوسرے کے ڈر سے بطور نفاق اس کا دین اختیار کرے۔

موجودہ عہد کی تعبیر میں اُسے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ''مذہب آزاد'' ہوجائے، یعنی مذہب کے معاملے میں لوگ آزاد ہوجائیں، کوئی شخص زبردستی کسی کا مذہب نہ بدلوائے، نہ کسی کے مذہب کے سبب اُسے ظلم اور اذیت سے گزارا جائے۔

---

(۱) دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ سورہ بقرہ

(۲) تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔ سورہ کافرون

(۳) وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا (یونس)

اس عمومی آزادی کی دلیل اللہ پاک کا یہ ارشاد ہے: لَآ اِكۡرَاهَ فِي الدِّيۡنِ قَدۡ تَّبَيَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَيِّ ۚ (بقرہ ۲۵۶) دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں، ہدایت ضلالت سے نمایاں ہو چکی ہے۔(۱)

اِس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ بعض انصار کے بچے بچپن سے ہی یہودی یا مسیحی بن گئے تھے تو اُن حضرات نے چاہا کہ اب زبرستی اُنھیں مسلمان بنالیں۔ اسی تناظر میں یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنھیں حکم فرمایا کہ دین کے معاملے میں بچوں پر جبر نہ کریں بلکہ اُنھیں اختیار دیں۔لیکن [اگر مسلمانوں کی آزادی مذہب چھینی جاتی ہے تو] مسلمان اپنی آزادی مذہب کے لیے لڑیں گے، تاہم مسلمان اپنے مذہب کے لیے دوسروں کو مجبور نہیں کر سکتے۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر اللہ ورسول نے مشرکین کی سخت شرائط سے اسی لیے رضامندی فرمائی تھی کہ ان کے نتیجے میں جو صلح ہو رہی تھی اس سے مذہبی ظلم و جبر (religious persecution) کا خاتمہ ہو رہا تھا، اس سے مشرکین کے ساتھ اہل اسلام کے اختلاط کا دروازہ کھل رہا تھا اور مشرکین کو یہ موقع مل رہا تھا کہ اب وہ قرآن سن سکیں گے۔[تا کہ یہ بات واضح ہوجائے کہ محمد رسول اللہ جو کہہ رہے ہیں اس کی صداقت کتنی ہے اور یہ اختلاط کے بغیر ممکن نہ تھا۔]

دراصل یہ صلح، حکمت وموعظت کے ساتھ دعوت اسلام کے لیے ایک آزاد فضا پیدا کر رہی تھی اور مشرکین کے لیے یہ موقع فراہم کر رہی تھی کہ وہ قریب سے مسلمانوں کے اچھے احوال کو دیکھ سکیں۔اسی لیے اس صلح کے بعد کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے اس صلح کو فتح مبین سے موسوم کیا۔

اور جہاں تک حدیث میں قتل مرتد کی سزا کی بات ہے تو اس کی وجہ الگ ہے۔ دراصل کچھ لوگ اسلام کا مذاق اڑانے کے لیے اسلام قبول کر رہے تھے۔اس کے

---

(۱) مرشد گرامی فرماتے ہیں کہ عربی قواعد کے اعتبار سے لَآ اِكۡرَاهَ فِي الدِّيۡنِ میں لائے نفی جنس ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ مذہب کے معاملے میں جنس اِکراہ یعنی ہر قسم کے اِکراہ کی نفی کر دی گئی ہے۔اب سمجھنے کی بات یہ ہے کہ مذہب کے معاملے میں کسی سے انگلی اٹھا کر بات کرنا بھی اکراہ کی ایک صورت ہے، خواہ خفیف صورت ہی کیوں نہ ہو۔

سیاسی اور سماجی اسباب تھے جن کو اُن کے مقام پر ہم نے بیان کر دیا ہے۔(۱)

(۱) سورۂ آل عمران کی آیت نمبر: ۷۲ ہے: وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ. ''اہل کتاب کے ایک گروہ نے کہا: اہل ایمان پر جو پیغام نازل ہوا ہے اس پر صبح کو ایمان لے آؤ اور شام کو اس کا انکار کر دو، شاید دوسرے مسلمان بھی اس سے برگشتہ ہو جائیں۔'' اس کے تحت علامہ رشید رضا نے متعدد روایات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے یہ باتیں صرف زبانی نہ کیں، بلکہ ان پر عمل بھی کیا۔ چنانچہ ابن جریر مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ بعض یہود نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز فجر پڑھی اور ایک سازش کے تحت شام ہوتے ہوتے مرتد ہو گئے، تاکہ دوسروں کو یہ فریب دے سکیں کہ دین اسلام کو قبول کرنے کے بعد ان کے سامنے اس دین کی ضلالت ظاہر ہو گئی ہے۔ استاذ امام [شیخ محمد عبدہ] فرماتے ہیں: مذکورہ آیت میں اسلام سے روکنے کے حوالے سے یہود کی جس سازش کا ذکر ہوا ہے، دراصل وہ ایک انسانی فطری اصول کے پردے میں ہوئی ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ حق کی علامت یہ ہے کہ اس کی معرفت کے بعد کوئی اس سے برگشتہ نہیں ہوتا۔ اس نکتے کو حاکم روم ہرقل نے بھی سمجھ لیا تھا۔ اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اسے اسلام کی دعوت بھجوائی تو اس موقع پر اس نے حضرت ابوسفیان سے جو سوالات کیے ان میں ایک یہ بھی تھا: ''کیا اُس کے دین میں داخل ہونے کے بعد کچھ لوگ اس سے برگشتہ بھی ہوتے ہیں؟'' حضرت ابوسفیان نے نفی میں جواب دیا۔

یہود کا یہ گروہ اسی جہت سے لوگوں کو فریب دینے کے درپے تھا، تاکہ لوگ یہ کہنے لگیں: ''اگر اُن لوگوں پر اسلام کا بطلان ظاہر نہیں ہوتا تو اسلام قبول کرنے اور اس کے اندر کی چھپی ہوئی باتوں کو جاننے کے بعد یہ ہرگز اس سے مرتد نہیں ہوتے۔ کیوں کہ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ ایک انسان حق کی معرفت کے بعد اس سے برگشتہ ہو جائے اور بلا وجہ اس کی طلب کے بعد اس سے بے نیاز ہو جائے۔''

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر کچھ لوگوں نے ایسا مکر و فریب سے کیا تھا تو ان کے برخلاف کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو بطور مکر و فریب نہیں بلکہ بشوق اسلام قبول کرنے کے بعد بھی اس سے مرتد ہو گئے، پھر ایسے لوگوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معاملہ ایک دوسرے اصول کے تحت ہے۔ وہ یہ کہ بعض افراد حق سمجھ کر اس امید کے ساتھ کسی چیز کو قبول کرتے ہیں کہ انہیں اس سے فائدہ حاصل ہوگا۔ لیکن جب بعد میں ان کی امیدیں پوری نہیں ہوتیں تو وہ اُس سے برگشتہ ہو جاتے ہیں۔

میرے اوپر یہ منکشف ہوا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قتل مرتد کا حکم صرف انہیں لوگوں کو ڈرانے کے لیے دیا ہے جو شک پیدا کر کے دوسروں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی سازش کر رہے تھے۔ کیوں کہ ایسی سازشیں اگرچہ قوی صحابہ پر کوئی اثر نہیں چھوڑ سکتی تھیں، کیوں کہ یہ حضرات حق الیقین کے عارف اور عین الیقین تک واصل تھے، تاہم اس طرح کی سازشیں بعض کمزوروں کے لیے فریب کا سبب بن سکتی تھیں جو اطمینان قلب کے بغیر محض بت پرستی کے بالمقابل اسلام کی افضلیت کے پیش نظر داخل اسلام ہوئے تھے۔ مثلاً وہ حضرات جن کو مولفۃ القلوب کہا جاتا ہے۔ میری رائے میں اسی طرح سے اکراہ کے خلاف آیات اور قتل مرتد سے متعلق احادیث کے بیچ تطبیق دی جاسکتی ہے اور جیسا کہ مجھ پر ظاہر ہوا ہے، میں نے اسی کے مطابق فتویٰ بھی دیا ہے۔ وَاللهُ أَعْلَمُ'' (تفسیر المنار)

عربی زبان اور تاریخ اسلام کے تناظر میں آیت کریمہ کے الفاظ سے جو تفسیر واضح ہے وہ یہی ہے۔ البتہ! حضرت ابن عباس سے فتنہ کی تفسیر شرک بھی منقول ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہی تفسیر ابوالعالیہ، مجاہد، سدی، مقاتل اور زید بن اسلم سے بھی منقول ہے۔۔۔

ہم نے جو تفسیر کی ہے اس کی تائید امام بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے جو حضرت ابن عمر سے منقول ہے۔ ایک شخص حضرت ابن عمر کے پاس آیا اور کہنے لگا:

''اے ابوعبدالرحمٰن! کیا آپ نے اللہ کا یہ ارشاد نہیں سنا:

وَ اِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَہُمَا ۚ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰىہُمَا عَلَی الۡاُخۡرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیۡ تَبۡغِیۡ حَتّٰی تَفِیۡٓءَ اِلٰۤی اَمۡرِ اللّٰہِ ۚ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَہُمَا بِالۡعَدۡلِ وَ اَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ ﴿۹﴾

(حجرات)

''اگر اہل ایمان کی دو جماعتیں برسر پیکار ہو جائیں تو اُن دونوں کے بیچ مصالحت کراؤ، پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے کے خلاف اٹھ کھڑی ہو تو اُس باغی جماعت سے جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ حکم الٰہی کی طرف لوٹ آئے۔ چناں چہ جب وہ حکم الٰہی کی طرف لوٹ آئے تو اب ان کے بیچ انصاف کے ساتھ مصالحت کرادو اور اس معاملے میں انصاف پر قائم رہو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو اہل انصاف ہی پسند ہیں۔''

اس واضح حکم کے ہوتے ہوئے آپ جنگ میں شریک کیوں نہیں ہوتے، جیسا کہ اس کا حکم حق تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرما دیا ہے؟''

اِس کے جواب میں حضرت عبداللہ ابن عمر نے فرمایا: ''میں جنگ نہ کروں اور اس آیت سے عار دلایا جاؤں، میرے نزدیک یہ اس سے بہتر ہے کہ میں جنگ کروں اور اِس آیت سے عار دِلایا جاؤں: وَ مَنۡ یَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُہٗ جَہَنَّمُ خٰلِدًا فِیۡہَا وَ غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَ لَعَنَہٗ وَ اَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیۡمًا ﴿۹۳﴾ (نسا) ''جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرتا ہے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، جس میں وہ

ہمیشہ ہمیش رہے گا۔ اس کے اوپر اللہ کا غضب اور لعنت ہے اور حق تعالیٰ نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

وہ شخص گویا ہوا: '' اللہ کریم یہ بھی تو فرماتا ہے: وَ قَاتِلُوۡهُمۡ حَتّٰى لَا تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ ﴿۳۹﴾ (انفال) ''جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنے کا خاتمہ ہو جائے۔''

حضرت ابن عمر نے جواب دیا: ہاں! ہم نے اس پر عمل کیا، جب عہد رسالت میں اسلام اقلیت میں تھا اور آدمی کو اُس کے دین کے سبب ستایا جاتا تھا۔ دشمنان اسلام اُسے اس جرم میں قتل کر دیتے تھے یا باندھ کر رکھتے تھے، یہاں تک کہ اسلام اکثریت میں آ گیا اور فتنے کا خاتمہ ہو گیا۔

یہاں حضرت ابن عمر سورۂ انفال کی اس آیت کے حوالے سے فتنہ کی وہی تفسیر کر رہے ہیں جسے ہم نے آیت کا متبادر مفہوم بتایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اب مسلمانوں کی کثرت اور شوکت کے سبب فتنے کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب مشرکین مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ نہیں ڈھا سکتے۔ اگر لفظ فتنہ شرک کے معنی میں ہوتا تو حضرت ابن عمر یہ نہ کہتے۔ کیوں کہ شرک روئے زمین سے ختم نہیں ہوا تھا اور نہ ہی کبھی ختم ہو گا۔ ارشاد ہے: وَ لَوۡ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۱۸﴾ (ہود) ''اگر تمہارا رب چاہتا تو سارے لوگوں کو ایک اُمت بنا دیتا۔''

آیت مذکورہ کی تفسیر کرتے ہوئے ابن کثیر نے بھی یہ آیت پیش کی ہے اور اسی مفہوم کی کئی ایک روایات کا اضافہ کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ فتنۂ ابن زبیر کے زمانے میں دو لوگ حضرت ابن عمر کے پاس آئے اور گویا ہوئے: ''سب کی کارستانیاں آپ کے سامنے ہیں۔ آپ حضرت عمر ابن خطاب کے صاحب زادے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ پھر میدان میں نکلنے سے کون سی چیز آپ کے لیے مانع ہے؟''

آپ نے فرمایا: یہ بات مانع ہے کہ اللہ نے مجھ پر میرے مسلمان بھائی کا خون حرام کر دیا ہے۔

ان دونوں نے کہا: '' کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے: وَقَاتِلُوۡهُمۡ حَتّٰى لَا

تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ؕ۳۹ (انفال)'' اُن سرکش کفار سے اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک کہ فتنے کا خاتمہ نہ ہوجائے اور کل دین، اللہ کے تابع نہ بن جائے۔

آپ نے فرمایا: جی! ہم نے جنگ کی یہاں تک کہ فتنہ ختم ہوگیا۔ایک روایت میں یہ اضافہ ہے۔شرک مٹ گیااور دین اللہ کے لیے ہوگیا اورتم اس لیے جنگ کرنا چاہتے ہوتا کہ فتنہ پیدا ہواور دین غیر اللہ کے لیے ہوجائے۔

کہا جاتا ہے کہ کسی نے یہی آیت اُسامہ بن زیداور سعد بن مالک کے سامنے پیش کی تو آپ حضرات نے فرمایا: ہم نے جنگ کی، یہاں تک کہ فتنے کا خاتمہ ہوگیا اور کل دین اللہ کے لیے ہوگیا۔

یہ اوراس سے ماقبل کی روایت ابن مردویہ کی تفسیر میں ہے۔محمد ابن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ مجھے زہری کے واسطے سے عروہ ابن زبیر اور دیگر علما کے حوالے سے حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ کی یہ تفسیر پہنچی ہے: یہاں تک کہ کوئی مسلمان اپنے دین کے معاملے میں *persecution* کا شکار نہ ہو۔حَتّٰى لَا يُفْتَنَ مُسْلِمٌ عَنْ دِيْنِهٖ۔'' (تفسیر المنار، انفال:۳۹)

علامہ رشید رضا کی یہ تفسیر بظاہر منفرد معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ؕ۲۵۶ (البقرہ)، لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ؕ۶ (الکافرون) اوراس قسم کی دیگر آیات کے ذیل میں جو کچھ کہا گیاہے، یہ اسی کی توضیح وتکمیل ہے۔

مرشد گرامی شیخ ابوسعید صفوی دام ظلہ نے وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ؕ۳۹ (انفال) کے حوالے سے ایک لطیف نکتہ آفرینی فرمائی۔آپ فرماتے ہیں کہ دین کو قانون اور نظام حکومت کے معنی میں بھی لیا جاسکتا ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس آیت میں نظام الٰہی کے نفاذ کے لیے پوری دنیا سے جنگ کرنے کی بات کی جارہی ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ:

''اے نبی اور نبی کے صحابہ! سرزمین مکہ جہاں پر دھرم مافیاؤں نے اس وقت فتنہ یعنی دھرم کے نام پر اتیاچار(*religious persecution*)

جاری کر رکھا ہے، ان کے خلاف جنگ کرو، یہاں تک کہ اس اتیاچار کا خاتمہ ہو جائے ،لیکن اس کے بعد وہاں جس قانون کے تحت حکومت قائم ہو، وہ اللہ کا قانون ہو۔قانون الٰہی کے خلاف کسی کی مرضی شامل نہ ہو۔''

شیخ فرماتے ہیں کہ پوری دنیا کا نظام اسی اصول کے تحت قائم ہے کہ آئین حکومت کی بالادستی قائم ہو اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کا کسی کو بھی حق نہ ہو۔آئین حکومت سے بغاوت گردن زدنی جرم ہے۔جب انسانوں کے نظام میں انسانوں کے بنائے ہوئے آئین کے بارے میں یہ جذبات روا ہیں، پھر حقیقی اسلامی سلطنت کے اندر اسلامی آئین یعنی قانون الٰہی کے تعلق سے یہ جذبات کیوں کر، ناروا ہو سکتے ہیں؟

تاہم اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ جس زمین پر اسلام کی حقیقی حکومت قائم ہو، وہاں دوسروں کو زندگی یا آزادی مذہب کا حق حاصل نہیں ہوگا، کیوں کہ اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ:

أَلَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا ، أَوِ انْتَقَصَهُ، أَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهِ، أَوْ أَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيبِ نَفْسٍ، فَأَنَا حَجِيجُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (ابوداؤد، ۳۰۵۲،حدیث صحیح)

''جس نے کسی غیر مسلم شہری پر ظلم کیا، یا اس کی توہین کی ، یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالا ، یا اس کی مرضی کے بغیر اس سے کوئی چیز لے لی تو قیامت کے دن میں اس کا مقدمہ لڑوں گا۔''

چھٹا سوال

کیا جہاد مشرکین عرب پر آسمانی عذاب تھا؟

سورۂ براءت کی آیت نمبر ۱۴ ہے:

قَاتِلُوۡهُمۡ يُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ بِاَيۡدِيۡكُمۡ وَيُخۡزِهِمۡ وَيَنۡصُرۡكُمۡ عَلَيۡهِمۡ وَ يَشۡفِ صُدُوۡرَ قَوۡمٍ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۴﴾

اُن سے جنگ کرو، اللہ تعالیٰ اُنھیں تمھارے ہاتھوں سے سزا دے گا، اُنھیں رسوا کرے گا، اُن کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور اَہل ایمان کے سینوں کو ٹھنڈک پہنچائے گا۔

بعض اہل علم ۔عصر حاضر میں جن کی پیشوائی جناب جاوید احمد غامدی کر رہے ہیں۔ آیت مذکورہ سے اپنے اس موقف پر اِستدلال کرتے ہیں کہ مشرکین عرب چوں کہ اتمام حجت کے بعد بھی اِسلام نہیں لائے، اس لیے ان کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم ہوا۔ یہ بالواسطہ طور پر عذاب الٰہی کی ایک شکل تھی، جیسے پچھلی امتوں کو اُس وقت ہلاک کر دیا گیا جب اُنھوں نے اپنے پیغمبروں کی نافرمانی کی۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد یہی دوسری صورت پیش آئی۔ چناں چہ آپ کو اور آپ کے صحابہ کو جس طرح ظلم وعدوان کے خلاف قتال کا حکم دیا گیا، اسی طرح اس مقصد کے لیے بھی تلوار اُٹھانے کی ہدایت ہوئی۔ یہ خدا کا کام تھا جو اِنسان کے ہاتھوں سے انجام پایا۔ اُسے ایک سنت الٰہی کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ انسانی اخلاقیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

يُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ بِاَيۡدِيۡكُمۡ (اللہ اُنھیں تمھارے ہاتھوں سے سزا دے گا) کے الفاظ میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔'' (میزان، قانون جہاد، ص: ۵۷۸)

غامدی صاحب نے بظاہر قانون جہاد کا دفاع کیا ہے، لیکن دیکھیے کہ مذکورہ بالا دفاع کس قدر پر خطر ہے کہ خود اُنھیں بھی یہ کہنا پڑا کہ ''انسانی اخلاقیات سے اس [جہاد] کا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' یہ دفاع کی صورت میں اس الزام کو راست طور پر قبول کر لینا ہوا جسے ثابت کرنے کے لیے اسلام دشمن عناصر صدیوں سے جی جان لگائے ہوئے ہیں۔ صرف اتنی ہی سی بات سے اس تفسیر کی سنگینی کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ پھر آیت مذکور کی درست تفسیر کیا ہے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ سچ ہے کہ بہت سی سابقہ قوموں پر اُس وقت اللہ کا آسمانی عذاب نازل ہوا اور اُنھیں تباہ و برباد کر دیا گیا، جب اُنھوں نے مسلسل اپنے پیغمبروں کی باتوں کا انکار کیا اور اُن کے درپئے آزار ہوئے۔ لیکن اس پر مشرکین عرب کے ساتھ رسول اور اَصحاب رسول کی جنگوں کو قیاس کرنا اور اُنھیں عذاب الٰہی کی ایک شکل قرار دے کر غیر اِنسانی اور غیر اخلاقی عمل قرار دینا تشویش ناک ہے۔

اس کی چند وجوہات ہیں:

۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سراپا اخلاق جمیل ہیں۔ قرآن آپ کے بارے میں گواہی دیتا ہے: وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيۡمٍ (القلم: ۴) آپ کی بعثت کے مقاصد میں اعلیٰ انسانی اخلاقیات کی تکمیل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: بُعِثۡتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الۡاَخۡلَاقِ۔ (مستدرک، ۴۲۲۱) میں اعلیٰ اخلاقیات کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔ پھر یہ کہنا کہ آپ نے اس قسم کی جنگیں لڑیں جن کا انسانی اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں ہے، نہ صرف یہ کہ آپ کے شایان شان نہیں، بلکہ آپ کے مقصد بعثت کی بھی نفی ہے۔ اس لیے مذکورہ بالا قیاس ہرگز درست نہیں کہا جا سکتا۔

۲۔ سب سے پہلے تو ہمیں راست طور پر سورۂ براءت کی اسی آیت کو سیاق و سباق سے دیکھنا چاہیے۔ اگر پہلے اور بعد کی صرف ایک ایک آیت کو اس کے ساتھ جوڑ کر دیکھیں تو مسئلہ از خود واضح ہو جائے گا اور اِتمام حجت کا مذکورہ بالا اصول اس آیت سے ماورا فقط ایک

خودساختہ فلسفہ معلوم ہوگا۔(۱) ملاحظہ کیجیے:

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَ هَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَ هُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝۱۳ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ۝۱۴ وَ يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ وَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝۱۵

''کیا تم اس قوم سے جنگ نہیں کرو گے جس کے لوگوں نے اپنے معاہدے توڑے ہیں، اِس پیغمبر کو بے وطن کرنے کی کوششیں کی ہیں اور جنگ کی پہل کی ہے؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ جب کہ اگر تم مومن ہو تو تمھیں تو صرف اللہ سے ڈرنا چاہیے۔ ان سے جنگ کرو، اللہ تعالیٰ اُنھیں تمہارے ہاتھوں سے سزا دے گا، اُنھیں رسوا کرے گا، اُن کے خلاف تمہاری مدد کرے گا اور اَہل ایمان کے سینوں کو ٹھنڈک پہنچائے گا، اور اُن کے دلوں کے بوجھ کو ہلکا کرے گا۔ اللہ جس کی چاہے اس کی توبہ قبول کرے، اللہ علم وحکمت والا ہے۔''

حیرت ہے کہ کہاں اس آیت میں معاہدہ شکن، درپئے آزار رسول اور جنگ کی پہل کرنے والی ظالم وجابر قوم سے جنگ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور کہاں اتمام حجت کے مفروضے کے تحت اس سے یہ حضرات غیر انسانی اور غیر اخلاقی جنگ کا اثبات کر رہے ہیں! استغفر اللہ۔

۳۔ اب ایسی صورت میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ (اللہ تعالیٰ اُنھیں تمہارے ہاتھوں سے سزا دے گا) کے یہ معنی سمجھنا کہ جس طرح سابق انبیا کی دعوت کے انکار وتوہین کی پاداش میں ان کی قوموں کو آسمانی آفات وبلیات سے تباہ کر دیا گیا، اسی طرح آخری پیغمبر کی دعوت کا جب ان کی قوم نے انکار کیا تو اسے تباہ وبرباد

---

(۱) یہ سارے مسائل ہی اس وجہ سے پیدا ہوئے کہ ہم نے ایک آیت کو پکڑ لیا اور اس کے آگے پیچھے کی کڑیوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ مثلاً کوئی شخص کسی کے ذریعے کسی کے قتل کا ذکر کرے اور آگے پیچھے کے جملے نہ دیکھے جن میں عدالتی فیصلے کا بیان ہو۔ ظاہر ہی یہ طرز مطالعہ ہمیشہ غلط فہمیوں کو جنم دے گا۔

کرنے کے لیے انسانی اخلاقیات کے خلاف سنت الٰہیہ کی حیثیت سے آپ اور آپ کے صحابہ کو۔العیاذ باللہ!۔تلوار اُٹھانے کی ہدایت ہوئی، قطعاً درست نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ظالموں اور جابروں کو پیغمبر اور آپ کے اصحاب نے جو کیفر کردار تک پہنچایا، مذکورہ بالا آیت میں اس کا ایک سادہ بیان ہے، البتہ! اس سادگی میں اعمال کی اصل نوعیت کھول کر رکھ دی گئی ہے اور وہ یہ کہ اگر چہ بظاہر یہ کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا اصل فاعل اللہ تعالیٰ ہی ہے، جیسا کہ بندوں کے تمام اعمال کا حقیقی فاعل وہی ہے۔قرآن میں اس کے بہت سے نظائر ہیں۔

الف: وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (الصافات:۹٦) اللہ نے ہی تم کو اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا۔

ب: فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ﴿۱۷﴾ (انفال) اُنھیں تم لوگوں نے قتل نہیں کیا، بلکہ اُنھیں تو اللہ نے قتل کیا اور اے نبی! جب آپ نے کنکر پھینکے تو آپ نے نہیں پھینکے بلکہ اُنھیں تو اللہ نے پھینکا۔

۴۔سابق امتوں پر عذاب آسمانی کا نازل ہونا ان انبیا کی صداقت کے لیے دلیل ومعجزہ ہوا کرتا تھا، مثلاً حضرت نوح کی قوم نے ان کی دعوت قبول نہیں کی تو آخر میں اُن کو متنبہ کیا کہ اگر تم ہماری دعوت قبول نہیں کرتے تو عنقریب ایک طوفان آنے والا ہے جو تم سب کو تباہ و برباد کردے گا، اِلا یہ کہ تم مجھ پر ایمان لاؤ اور میری کشتی میں سوار ہو جاؤ۔اس کے بعد بھی وہ نہیں مانے، بالآخر طوفان آیا اور اُنھیں غرق کرتا ہوا چلا گیا۔اس سے ان تباہ اقوام پر پیغمبر کی صداقت واضح ہوگئی۔

اس کے برخلاف اگر انسانی جنگ کو بھی آسمانی تباہی پر قیاس کرتے ہوئے اسے عذاب الٰہی کی ایک شکل باور کیا جائے تو اُس سے مذکورہ بالا مقصد حاصل نہیں ہوگا، بلکہ اس سے پیغمبر کے اعجاز وصداقت کے بجائے ایک ظالم کا ظلم وجور ثابت ہوگا، جس کی بات نہ مانی جائے تو اس کا نتیجہ قتل وقتال کی صورت میں سامنے آتا ہے۔مزید یہ کہ اگر جنگی فتح کو صداقت کی دلیل بنایا جائے تب تو دنیا کے تمام ظالموں اور جابروں کے ظلم وجور کو دلیل صداقت حاصل ہو جائے گی۔اس پر طرفہ یہ کہ پیغمبر علیہ السلام کی جنگوں کا نتیجہ ہمیشہ فتح کی صورت میں

سامنے نہیں آیا، بلکہ بعض اوقات ظاہری شکست کا بھی سامنا رہا۔ پھر ایسی صورت میں ان جنگوں کو اِتمام حجت کے مفروضہ کے تحت مدعو قوم کی تباہی اور داعی کی صحت وصداقت کی دلیل کیسے بنایا جاسکتا ہے؟ بطور خاص اس صورت میں کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کے خلاف قرآن کا واضح حکم موجود ہے: وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ (یونس) اگر تمہارا رب چاہتا تو تمام اہل زمین ایمان لے آتے، کیا تم لوگوں کو اِس بات پر مجبور کروگے کہ وہ ایمان لے آئیں۔

۵۔ حقیقت یہ ہے کہ انکار اور تنقیص دعوت کی پاداش میں امت محمدیہ پر آسمانی عذاب کا نزول ہوا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ محمد عربی روحی فداہ اور ان کی امت پر بطور خاص ایسا کریم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے آپ کی امت پر عذاب نازل ہی نہیں کرنا چاہتا۔ ارشاد باری ہے: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ﴿۳۳﴾ (انفال) آپ کے ان کے بیچ رہتے اللہ اُنھیں عذاب نہیں دے گا۔ اس سلسلے میں مزید تفصیلات آگے آرہی ہیں۔

۶۔ اب مذکورہ آیت کے تحت بعض معروف مفسرین قرآن کی آرا دیکھتے ہیں:

الف: امام فخر الدین رازی (۶۰۶ھ) نے قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ سے پہلی والی آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ اس میں حق تعالیٰ نے تین ایسے اسباب کا ذکر کیا ہے، جن میں سے ہر ایک سبب انفرادی طور پر جنگ کو واجب کرتا ہے، چہ جائے کہ جب وہ تینوں ایک ساتھ پالیے جائیں۔ ایسی صورت میں بدرجۂ اولیٰ جنگ ناگزیر ہوجاتی ہے۔ وہ اسباب یہ ہیں:

۱۔ عہد شکنی

۲۔ پیغمبر کو شہر بدر کرنے کی سازش

۳۔ اور جنگ میں پیش قدمی

اس کے بعد قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ کے ذیل میں یہ سوال اٹھایا کہ جب اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کے ہوتے ہوئے ان کے دشمنوں پر بھی عذاب نازل نہیں کرے گا۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ﴿۳۳﴾ (انفال) پھر یہاں قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ میں مسلمانوں کے ہاتھوں اُنھیں عذاب دینے کی بات کیوں کی گئی ہے؟

امام رازی نے پھر خود ہی اس اعتراض کا جواب دیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ عذاب الٰہی دوطرح سے ہوتا ہے، ایک تو آسمانی بلاؤں کی صورت میں عمومی استیصال وتباہی کا ہوتا ہے اور وہ مجرموں اور غیر مجرموں سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، دوسرا خدا کے نیک بندوں کے ذریعے اپنا عذاب نازل کرتا ہے، لیکن یہ عذاب غیر مجرموں کے لیے نہیں، بلکہ محض مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے ہے۔ (تفسیر کبیر)

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اس آیت کریمہ میں اصحاب رسول کے ہاتھوں مجرموں کو سزا دینے کی بات کی گئی ہے اور اس آیت سے پہلے والی آیت میں ان مجرموں کے تین ایسے جرائم بیان کیے گئے ہیں، جن میں سے ہر ایک ان کو سزا دینے کا جواز ثابت کرتے ہیں، لیکن بعض افراد نے ایسی واضح منطقی اور معقول سزا کو اِتمام حجت کے مفروضے کے تحت اسے آسمانی بلاؤں پر قیاس کر کے غیر انسانی اور غیر اخلاقی سزاؤں کے زمرے میں ڈال دیا۔

ب: قاضی بیضاوی (۶۸۵ھ) فرماتے ہیں کہ قَاتِلُوهُمْ میں اسباب جنگ کے پیش نظر جنگ کا حکم بیان ہوا ہے اور ترک جنگ پر توبیخ وملامت کی گئی ہے۔ يُعَذِّبْهُمُ اللهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ اُن کے لیے جنگ کرنے کی صورت میں فتح کا وعدہ ہے اور ان مجرموں کے قتل وغارت پر قدرت دینے کا عہد ہے۔ نیز وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ میں جن مومنین کے دلوں کو ٹھنڈک پہنچانے کی بات کی گئی ہے، وہ بنوخزاعہ ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ یمن اور سبا کے کچھ لوگ مکہ آئے اور اسلام قبول کیا۔ جب وہ واپس ہوئے تو اُنھیں اپنی قوم کی جانب سے بڑی اذیت ناکیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان حضرات نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا۔ خوش ہو جاؤ، کیوں کہ عنقریب یہ مصیبت ختم ہونے والی ہے۔ چناں چہ اللہ نے بہت جلد اُن کے دلوں کی ٹھنڈک کا سامان بہم پہنچا دیا۔ اللہ نے ان کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا، اُسے پورا فرما دیا۔ یہ آیت قرآن کے معجزات میں سے ہے۔ (تفسیر بیضاوی)

ج: علامہ ابن کثیر (۷۷۴ھ) نے قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللهُ بِأَيْدِيكُمْ اور اُس سے پہلے والی آیت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ بھی ان مشرکین کے خلاف جنگ کی تحریک وترغیب ہے، جنھوں نے معاہدے توڑے تھے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو

شہر بدر کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ اس کے چند سطروں کے بعد لکھا ہے کہ یہاں جن لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم ہوا ہے، وہ قریش ہیں جنھوں نے بدر کے موقع پر جنگ میں پیش قدمی کی تھی۔ پہلے تو وہ اپنے قافلے کی حفاظت کے لیے نکلے تھے، لیکن پھر یہ معلوم ہونے کے بعد بھی کہ ان کا قافلہ محفوظ ہے، وہ پیچھے پلٹنے کے بجائے تکبر اور سرکشی میں چُور جنگ کے لیے آگے بڑھنے لگے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں قبیلہ بنوبکر کے لوگ مراد ہیں جنھوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف خزاعہ سے عہد شکنی کی تھی اور ان کے ساتھ جنگ کی شروعات کی تھی۔ (تفسیر ابن کثیر)

غور کیجیے، کہاں اس آیت کا حقیقی پس منظر اور کہاں مذکورہ بالا غیر انسانی اصول جنگ کا خود ساختہ فلسفہ!

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا!

ایک وضاحت

گذشتہ اقوام پر خدائی عذاب کیوں نازل ہوا؟

گذشتہ اقوام پر حق تعالیٰ کی طرف سے جو آسمانی عذاب نازل ہوا، اس کی وجہ ان کے مظالم اور جرائم تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِن قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ (۱۳) [یونس]

تم سے پہلے کئی اقوام کو ہم نے اس وقت ہلاک کر دیا، جب وہ ظلم کرنے لگے، اس کے بعد کھلے معجزات کے ساتھ ان کے پاس اللہ کے پیغمبر آئے، لیکن وہ ماننے کو تیار نہ ہوئے۔ ہم جرائم پیشہ اقوام کو ایسے ہی سزا دیتے ہیں۔

مذکورہ آیت کریمہ (۱) اور گذشتہ اقوام پر نزول عذاب کے حوالے سے قرآنی تفصیلات (۲) کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ قوموں پر بھی محض انبیا کی طرف سے اتمام حجت کے بعد عذاب نازل نہیں ہو گیا، بلکہ اس کے ساتھ ان کی قوموں کی طرف

---

(۱) اگرچہ عام مفسرین نے یہاں ''ظلم'' کی تفسیر کفر و شرک سے کی ہے، تاہم ہمارا استدلال لفظ کے ظاہر اور عموم سے ہے، جس کی تائید گذشتہ اقوام پر نزول عذاب کی قرآنی تفصیلات سے ہوتی ہے۔

(۲) دیکھیے قوم عاد کی تباہی کی تفصیل کے لیے (سورۂ اعراف: ۶۵ - ۷۲)، قوم ثمود پر عذاب کی تفصیل کے لیے (سورۂ النمل: ۴۵ - ۵۳، اعراف: ۷۳ - ۷۹، ہود: ۶۱ - ۶۸، اسرا: ۵۹، شعرا: ۱۴۱ - ۱۵۹)، قوم لوط کی ہلاکت کی تفصیل کے لیے (شعرا: ۱۶۰ - ۱۷۵، نمل: ۵۴ - ۵۸، ہود: ۶۹ - ۸۳، حجر: ۵۱ - ۷۷، اہل مدین کے خاتمے کی روداد کے لیے: (اعراف: ۸۵ - ۹۳، ہود: ۸۴ - ۹۵، اور بنی اسرائیل کی غرقابی کی داستان کے لیے (سورہ اعراف میں آیت ۱۰۳ / سے آگے، سورہ بقرہ آیت ۴۹ - ۵۰، یونس: ۷۵ تا ۹۳، وغیرہ)

سے عام انسانوں کے ساتھ ظلم و ناانصافی کی انتہا، پیغمبروں اور اُن کے متبعین کا استہزا، ان کے قتل و قید کی کوشش، انھیں دین حق سے منحرف کرنے کے لیے ان پر دباؤ اور قتل و شہر بدری کی دھمکی، بدفعلی و بے حیائی میں دوسروں کے ساتھ جرأت و جسارت، انبیا کی طرف سے دعوت اور افہام و تفہیم اور اظہار معجزات کے بعد بھی اُن کے خلاف قومی، ملی اور قبائلی مظالم کا تسلسل، عقیدے کی بنیاد پر پیغمبروں اور ان کے اصحاب کے خلاف تشدد (religious persecution) پھر اِس سب کے بعد بطور اِستہزا اُن سے یہ مطالبہ کے چلو اپنے خدا سے کہو کہ اب وہ ہم پر اپنا عذاب نازل کر کے دکھائے۔ یعنی باری تعالیٰ کو کھلا چیلنج۔ العیاذ باللہ!

یہ اور اس قسم کے دوسرے ایسے جرائم ہیں جن کی تفصیلات پڑھنے کے بعد یہ کہنا ہی درست نہیں ہے کہ سابقہ قوموں کے منکرین حق پر اللہ نے محض اتمام حجت کے قانون کے تحت عذاب نازل کیا، اس کے پیچھے انسانی اخلاقیات کی سطح پر اس کا کوئی معقول سبب نہیں تھا، چہ جائے کہ اس پر قیاس کر کے یہ کہا جائے کہ اُسی طرح کی انسانی اخلاقیات سے ماورا عذاب، اللہ نے اپنے آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین پر نازل فرمایا اور یہ عذاب خود پیغمبر اور اُن کے متبعین کے ہاتھوں سے نازل فرمایا۔ یہ پوری کہانی ایک افسانوی مفروضہ پر قائم ہے، جس کی کوئی علمی بنیاد موجود نہیں ہے۔ سابقہ امتوں کی ہلاکت کی بھی معقول وجوہات موجود ہیں، جس طرح امت محمدیہ کو جو جنگ کی اجازت دی گئی وہ معقول اسباب اور انسانی اخلاقیات کے مطابق دی گئی۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بالفرض اگر پیغمبر کی دعوت کے محض انکار پر آسمانی عذاب نازل بھی ہو تو یہ عذاب اس پیغمبر کی صداقت کی دلیل بن جائے گا، اس کے برخلاف اگر کسی دوسرے پیغمبر کی دعوت کے سادہ انکار پر خود وہ پیغمبر اور اس کے متبعین تلوار چلانے لگیں تو یہ عمل بجائے اس کے صادق ہونے کے ظالم ہونے کی دلیل بن جائے گا۔ یہ نکتہ اس فرق کو واضح کرتا ہے جو آسمانی اور انسانی عذابوں کے بیچ ہے۔ لہٰذا اُن میں سے ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اتمام حجت کا مفروضہ رکھنے والوں کو اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے۔

ایک مغالطہ اور اس کا ازالہ

ممکن ہے کوئی شخص سابقہ امتوں کے حوالے سے بعض آیات پیش کر کے کہے کہ دیکھیے فلاں امت پر نزول عذاب کی وجہ قرآن میں اپنے پیغمبر کی دعوت سے انکار بتائی گئی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے قرآنی بیانات محض اجمالی نوعیت کے ہیں، جن کی تفصیل خود قرآن کے اندر دوسرے مقامات پر موجود ہے، جہاں بتایا گیا ہے کہ اُس قوم پر نزول عذاب کی وجہ محض قبول دعوت سے انکار نہیں ہے، بلکہ اس کے پیچھے اصل محرک ان کے دیگر اخلاقی اور سماجی جرائم ہیں۔ اس لیے اِس سلسلے کے کسی واقعہ سے متعلق رائے قائم کرنے میں جلد بازی کے بجائے اسے معروضی طور پر سمجھنا چاہیے اور اس مسئلے سے متعلق دیگر آیات کو بھی سامنے رکھنا چاہیے، اس کے بعد ہی حقیقت اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ سامنے آئے گی۔

اس کی واضح مثال یہ ہے کہ سورۂ آل عمران (آیت: ۱۱) میں کہا گیا ہے کہ فرعونیوں اور ان سے پچھلی قوموں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تو اللہ نے ان کے گناہوں کے سبب ان کی شدید گرفت فرمائی۔ (۱)

اس سے اول نظر میں ایسا لگتا ہے کہ صرف آیات الٰہیہ کے انکار کے سبب ہی ان قوموں پر عذاب کا نزول ہوا، جب کہ سورہ بقرہ (آیت: ۴۹) میں فرعونیوں کے عذاب کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ وہ اسرائیلی بچوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور صرف بچیوں کو زندہ چھوڑتے تھے۔ (۲)

اس سے دوسری قوموں کے بارے میں بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان پر جو عذاب نازل ہوا، اس کی وجہ بھی قبول دعوت سے انکار نہیں تھی، بلکہ اس کے علاوہ دیگر ایسے اسباب بھی تھے، جو نزول عذاب کے متقاضی تھے۔

---

(۱) كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ (آل عمران: ۱۱)

(۲) وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ (البقرة: ۴۹)

ایک مناسب توجیہ

اتمام حجت کے مفروضہ فلسفے کی ایک توجیہ یوں کی جاسکتی ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ اگر کوئی قوم کسی پیغمبر سے کوئی خاص معجزہ طلب کرتی ہے اور وہ پیغمبر وہ معجزہ پیش کر دیتا ہے تو اب اتمام حجت ہو چکا، اب اس کے بعد اس قوم کے لیے واجب ہو جاتا ہے کہ وہ اس نبی پر ایمان لے آئے، بصورت دیگر اس قوم کی ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ: وَمَا مَنَعَنَا أَن نُّرْسِلَ بِالآيَاتِ إِلاَّ أَن كَذَّبَ بِهَا الأَوَّلُونَ (وہ معجزات دینے سے ہمارا لیے کوئی چیز مانع نہیں تھی، مگر یہ بات کہ پچھلوں نے معجزات کو جھٹلا دیا تھا۔) [الإسراء: ۵۹] کے تحت علامہ قرطبی (۶۷۱ھ) رقم طراز ہیں:

''یہاں کلام کا ایک حصہ محذوف ہے۔ پوری عبارت یوں بنے گی: ''[جن کا انہوں نے مطالبہ کیا تھا] وہ معجزات دینے سے ہمارا لیے کوئی چیز مانع نہیں تھی، مگر یہ بات کہ] یہ ان کو جھٹلا دیں گے، جس کے بعد وہ ہلاک کر دیے جائیں گے، جیسا کہ پچھلوں کو ہلاک کر دیا گیا تھا، جب] پچھلوں نے معجزات کو جھٹلا دیا تھا۔'' یہ معنی قتادہ اور ابن جریج وغیرہ نے بتائے ہیں۔ اس طرح حق تعالیٰ نے کفار قریش سے عذاب کو روک دیا، اس لیے کہ اللہ کو معلوم تھا کہ ان میں بہت سے ایمان لائیں گے اور بہت سے بچے ان مومنین کے گھر پیدا ہوں گے۔۔۔ کفار قریش نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے صفا پہاڑ کو سونا بنا دے اور موجودہ پہاڑیاں ان سے دور ہو جائیں۔ اس وقت حضرت جبرئیل آئے اور کہا: اگر آپ چاہیں تو آپ کی قوم کے مطالبات پورے کر دیے جائیں، لیکن اگر اس کے بعد یہ ایمان نہیں لاتے تو پھر انہیں مہلت نہیں ملے گی اور اگر آپ چاہیں تو آپ کی قوم کو ابھی مہلت دی جائے۔ حضور نے فرمایا: ان کے حق میں یہی بہتر ہے کہ انہیں آپ مہلت دیں۔''

اس توجیہ سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ پیغمبروں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد نزول عذاب کا مطلب یہ ہے کہ ان کی قوم کی طرف سے طلب کیے گئے معجزات پیش کر دیے جانے کے بعد بھی اگر وہ ایمان نہیں لاتے تو انہیں آسمانی عذاب کے ذریعے ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

۲۔یہ عذاب کفار قریش پر نازل ہی نہیں ہوا، لہٰذا اصحاب رسول کی جنگوں کو اس باب سے سمجھنا محض غلط فہمی ہے۔

۳۔اس سے یہ اشکال بھی رفع ہوجاتا ہے کہ بعض معجزات تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھی دیے گئے تھے، جن میں سب سے نمایاں چاند کا دو ٹکڑے ہونا ہے، جس کا ذکر صحیحین میں آیا ہے۔(۱) پھر اس کے بعد قریش پر عذاب کا نزول کیوں نہیں ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ معجزات قریش کی طلب پر نہیں دیے گئے تھے، محض شان نبوت کے اظہار کے لیے دیے گئے تھے اور جو معجزات براہ راست قریش نے طلب کیے تھے یہ وہ معجزات نہیں تھے اور نزول عذاب ان معجزات کے بعد ہوتا ہے، متعین طور پر قوم نے جن کا مطالبہ کیا ہو۔

ایک دوسری توجیہ

فلسفۂ اتمامِ حجت کی ایک مناسب توجیہ یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ حق تعالیٰ نے انبیا کو اصلاح امت کا کام سونپا ہے۔ اس اصلاح کے دو رخ ہیں، حق اللہ یعنی عباداتی امور اور حق العباد، یعنی معاملاتی امور۔ عباداتی امور میں سزا و جزا کا تعلق آخرت سے ہے، جب کہ معاملاتی امور میں سزا و جزا کا تعلق دنیا اور آخرت دونوں سے ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی قوم دعوت توحید قبول نہیں کرتی ہے تو اس کی سزا اسے آخرت میں ملے گی، لیکن اگر کوئی قوم دنیا میں ظلم و جبر اور ناانصافی کی خوگر ہے تو اسے پیغمبروں کی دعوتِ اصلاح قبول کرنا ہی ہوگا۔ اگر پیغمبروں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد بھی وہ قوم ظلم و جبر سے باز نہیں آتی ہے اور ان کا استہزا کرتے ہوئے الٹے ان سے نزول عذاب کا مطالبہ کرتی ہے تو پھر ایسی قوم اسی لائق ہے کہ اسے آسمانی عذاب سے تباہ کر دیا جائے۔ اللہ کریم کا ارشاد ہے: **وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا رَسُولًا يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ (٥٩)** [القصص] تمہارے رب نے پچھلی بستیوں کو اس وقت تک ہلاک نہیں کیا، جب تک ان کے بیچ کسی پیغمبر کو نہ بھیج دیا، جو ان کے سامنے حقائق و شواہد پیش کرتا اور تمہارے رب نے انہی بستیوں کو ہلاک کیا جن کے باشندے ظالم تھے۔

۞۞۞

---

(۱) بخاری، فضائل الصحابۃ، باب انشقاق القمر /مسلم، صِفَةِ الْقِيَامَةِ، باب انشقاق القمر

ساتواں سوال

کیا مشرکین عرب کے لیے دو ہی راستے تھے، اسلام یا تلوار؟

اسلام کے فلسفۂ جنگ میں جبر و اکراہ کو جن حضرات نے تسلیم کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ معاملہ صرف مشرکین عرب کے ساتھ تھا دوسرے لوگوں کے ساتھ جنگ کے لیے تو یہ شرط ملحوظ ہے کہ ان کی طرف سے پہل یا زیادتی ہو تو جنگ کی جائے، مگر کم از کم مشرکین عرب اس عام اخلاقی اصول سے مستثنیٰ ہیں۔ چوں کہ ان کے معاملے میں پیغمبر علیہ السلام کا اتمام حجت اپنی آخری حد کو پہنچ چکا تھا، اس لیے ان کے لیے دو ہی راستے تھے، یا تو اسلام قبول کرکے اسلام کے فیوض و برکات سے مستفیض ہوں، یا پھر تلوار سے دو دو ہاتھ کرنے کو تیار ہو جائیں، تیسرا کوئی آپشن نہیں تھا۔(۱)

اس سلسلے میں عرض ہے کہ سرے سے ایسی کوئی حدیث ہی نہیں ہے کہ مشرکین عرب کے لیے صرف دو ہی آپشن ہیں، اسلام یا تلوار۔ اس سلسلے میں اہل علم نے جو کچھ کہا ہے، اس پر گہرائی کے ساتھ غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔ اس تعلق سے ضروری توضیح پچھلے صفحات میں ''فتنہ اور اِزالۂ فتنہ کی حقیقت'' کے ذیل میں آیت کریمہ (اور اُن سرکش کفار سے اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک کہ فتنے کا خاتمہ نہ ہو جائے اور دین اللہ کے تابع نہ بن جائے۔) کی چوتھی تفسیر کے تحت کر دی گئی ہے۔

ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ اس مفہوم کی روایات موجود ہیں جن میں یہود و مشرکین کو عرب سے نکالنے کی بات کی گئی ہے۔ مثلاً یہ روایات:

---

(۱) میزان، قانون جہاد، ص: ۵۷۸ / البیان، البقرۃ: ۱۹۳

۱۔أَخۡرِجُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ مِنۡ جَزِيۡرَةِ الۡعَرَبِ۔مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔(صحیح بخاری،حدیث:۳۰۵۳،صحیح مسلم،حدیث:۱۶۳۷)

۲۔لَأُخۡرِجَنَّ الۡيَهُوۡدَ ، وَالنَّصَارىٰ مِنۡ جَزِيۡرَةِ الۡعَرَبِ حَتّٰى لَا أَدَعَ إِلَّا مُسۡلِمًا۔ میں یہود ونصاریٰ کوضرور جزیرۂ عرب سے نکال دوں گا اور سوائے مسلمانوں کے، یہاں کسی کونہیں رہنے دوں گا۔(صحیح مسلم،حدیث:۱۷۶۷)

۳۔لَا يُتۡرَكُ بِجَزِيۡرَةِ الۡعَرَبِ دِيۡنَانِ۔جزیرۂ عرب میں دو دین باقی نہیں رہیں گے۔(مسند احمد،۲۶۳۵۲،صحیح لغیرہ/شعیب الارنؤوط)

لیکن یہاں چند سوال بہت اہم ہیں،اس مسئلے کی درست تفہیم کے لیے جن کا سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔

جزیرۃ العرب سے کیا مراد ہے؟

یہاں پہلا سوال یہ ہے کہ ان احادیث میں جزیرۃ العرب(۱) سے کیا مراد ہے؟ اس کے جواب میں امام ابن عبدالبر نے حسب ذیل اقوال لکھے ہیں:

۱۔مکہ،مدینہ اور یمن

۲۔مکہ،مدینہ،یمامہ اور یمن

۳۔پورا خطۂ عرب

۴۔طول میں عدن سے وادی عراق تک اور عرض میں اطراف جدہ سے اطراف شام تک۔(الاستذکار،کتاب الجامع،ماجاء فی إجلاء الیہود من المدینۃ)

۵۔قاضی عیاض مالکی نے لکھا ہے کہ ایک روایت کے مطابق۔جو امام مالک کے دو

---

(۱)جزیرہ نما عرب(Arabian Peninsula)جنوب مغربی ایشیا میں افریقا اور ایشیا کے سنگم پر واقع ہے، جس کا بیشتر حصہ صحرائی ہے۔موجودہ عہد میں جزیرہ نما عرب مشرق وسطیٰ کا اہم ترین حصہ ہے اور تیل اور گیس کے وسیع تر ذخائر کے باعث خطے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔جزیرہ نما عرب کا ساحل مغرب میں بحیرۂ احمر اور خلیج عقبہ، جنوب مشرق میں بحیرۂ عرب اور شمال مشرق میں خلیج عمان،آبنائے ہرمز اور خلیج فارس سے ملتا ہے۔شمال میں جزیرہ نما عرب کی حدود کوہ زاگرس(عربی:زاغروس)تک جا کر ختم ہوجاتی ہیں۔جغرافیائی طور پر یہ بغیر کسی واضح علامت کے صحرائے شام سے مل جاتا ہے۔درج ذیل ممالک اس وقت جزیرہ نما کا حصہ سمجھے جاتے ہیں:بحرین(تکنیکی طور پر جزیرہ نما سے کٹا ہوا ایک جزیرہ ہے)،کویت،سلطنت عمان،سعودی عرب،متحدہ عرب امارات،یمن۔جزیرہ نما کا بیشتر حصہ سعودی عرب میں شامل ہے اور آبادی کی اکثریت بھی سعودی عرب اور یمن میں رہائش پذیر ہے۔

اقوال میں سے ایک ہے۔ یہاں جزیرۃ العرب سے مدینہ منورہ مراد ہے۔(۱)[امام مالک کے معروف قول کے مطابق مکہ، مدینہ، یمن اور یمامہ سب جزیرۂ عرب میں شامل ہیں۔]

۶۔ایک قول یہ ہے کہ یہاں جزیرۃ العرب سے مراد ارض حجاز ہے۔امام ابن ملقن (۲)فرماتے ہیں کہ اس کی تائید مسند احمد کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری الفاظ یہ تھے:

"أَخْرِجُوْا يَهُوْدَ الْحِجَازِ وَأَهْلَ نَجْرَانَ مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ۔"

حجاز کے یہود اور اہل نجران کو جزیرۂ عرب سے نکال دو۔

چوں کہ حضرت ابوبکر کو اُس کی فرصت نہیں ملی، اس لیے یہ فریضہ ان کے بعد حضرت عمر نے انجام دیا۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں جزیرۂ عرب سے مراد صرف حجاز ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یمن کے اہل کتاب کو کسی خلیفہ نے جلاوطن نہیں کیا، جب کہ وہ بھی جزیرۂ عرب میں شامل ہے۔

جہاں تک اہل نجران کو جزیرۂ عرب سے نکالنے کی بات ہے تو اس کی حکمت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اس بات پر مصالحت کی تھی کہ وہ سودی کاروبار نہیں کریں گے، اس کے باوجود انہوں نے یہ کاروبار شروع کر دیا۔"(۳)

اگر چہ بہت سے اہل علم نے امام ابن ملقن کی رائے کی تردید کی ہے اور اپنے مدعا کے اثبات میں یہ کہا ہے کہ یہی بہتر ہے کہ جزیرۃ العرب کو اس کے اطلاق پر رکھا جائے اور یمن کے اہل کتاب کے عدم اخراج کے سبب جزیرۂ عرب سے یمن کو خارج نہ کیا جائے۔

---

(۱)اِکمالُ المعلمِ بفوائد مُسلم، کتاب الوصیة، باب ترک الوصیة لمن لیس له شیء یوصی فیه

(۲)امام ابوحفص سراج الدین ابن ملقن (۷۲۳ھ-۸۰۴ھ) مصر کے اکابر شافعی علما میں سے ایک ہیں۔ حدیث، تاریخ اور فقہ میں آپ کی غیر معمولی خدمات ہیں۔آپ کے تلامذہ میں امام ابن حجر عسقلانی اور علامہ جلال الدین محلی کے اسما شامل ہیں۔تقریباً تین سو کتابیں آپ سے یادگار ہیں، جن میں یہ کتابیں بہت اہم ہیں:التوضیح لشرح الجامع الصحیح، کافي المحتاج إلی شرح المنهاج في علم الاصول، عمدة المحتاج في شرح المنهاج للنووي۔

(۳)التوضیح لشرح الجامع الصحیح، باب جَوَائِزِ الوَفْدِ

ممکن ہے کہ خلفا کے پاس کوئی عذر یا کوئی مجبوری رہی ہوگی، اس لیے انہوں نے یمن کے اہل کتاب کو وہاں سے نہیں نکالا ہوگا، جس طرح حضرت ابوبکر نے خیبر کے یہود کو نہیں نکالا اور ایسا اُن کی دیگر ضروری مصروفیات کے سبب تھا۔

اس کے باوجود غور سے دیکھا جائے تو کئی جہتوں سے امام ابن ملقن کی رائے کو تقویت ملتی ہے۔ اس رائے کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ یمن کے اہل کتاب کو کسی خلیفہ نے وہاں سے جلاوطن نہیں کیا۔ آخر سب کے لیے کیا عذر ہو سکتا تھا؟ امام شافعی کا موقف ۔ جو آگے آ رہا ہے۔ اس سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ حدیث دجال سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاز کو جو خصوصی اہمیت و امتیاز حاصل ہے وہ کسی دوسرے خطے کو نہیں ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

لَيْسَ مِنْ بَلَدٍ إِلَّا سَيَطَؤُهُ الدَّجَّالُ، إِلَّا مَكَّةَ، وَالمَدِينَةَ، لَيْسَ لَهُ مِنْ نِقَابِهَا نَقْبٌ، إِلَّا عَلَيْهِ المَلَائِكَةُ صَافِّينَ يَحْرُسُونَهَا. (متفق علیہ)

دجال، مکہ ومدینہ کے علاوہ پورے روئے زمین کو روندتا چلا جائے گا، البتہ ارض حرمین کے ہر راستے پر صف بستہ فرشتے کھڑے ہوں گے، جو دجال سے اس زمین کی حفاظت کریں گے۔

مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حسب ذیل تصریح بھی امام ابن ملقن کی رائے کی تائید وتوثیق کرتی ہے۔ فرماتے ہیں:

عرف النَّبِي صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَن الزَّمَان دوَل وسجال فَرُبمَا ضعف الْإِسْلَام وانتشر شَمله فَإِن كَانَ الْعَدو فِي مثل هَذَا الْوَقْت فِي بَيْضَة الْإِسْلَام ومحتده أفْضى ذَلِك إِلَى هتك حرمات الله وقطعها فَأمر بإخراجهم من حوالي دَار الْعلم وَمحل بَيت الله.

وَأَيْضًا المخالطة مَعَ الْكفَّار تفْسد على النَّاس دينهم وَتغير نُفُوسهم، وَلما لم يكن بُد من المخالطة فِي الأقطار أَمر بتنقية الْحَرَمَيْنِ مِنْهُم۔

وَأَيْضًا انْكَشَفَ عَلَيْهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يكون فِي آخر الزَّمَان فَقَالَ: إِن الدّين ليأرز إِلَى الْمَدِينَة" الحَدِيث وَلَا يتم ذَلِك إِلَّا بِأَلا يكون هُنَاكَ من

أهل سَائِرِ الْأَدْيَان، وَالله أعلم.(۱)

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ زمانے کی گردش جاری رہتی ہے۔ ممکن ہے مستقبل میں کبھی اسلام کمزور ہوجائے اوراس کا شیرازہ بکھر جائے۔ایسے وقت میں اگر دشمن، اسلام کے قلب ومرکز میں رہا تو لازماً اس کے سبب اللہ کی حرمتوں کی پامالی اورتباہی ہوگی۔اسی لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہود ومشرکین کو مرکزِعلم اور خانۂ خدا کے اطراف سے دور کرنے کا حکم دیا۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ اختلاط مسلمانوں کے دین و روحانیت میں فساد وتغیر کا سبب بن سکتا ہےاور چوں کہ تمام اطراف عالم میں اس سے نجات ممکن نہیں ہے،اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حرمین طیبین کوغیر مسلموں سے پاک کرنے کا حکم دیا۔

یہ پہلوبھی اہم ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آخری زمانے کے احوال منکشف تھے۔ اسی لیے آپ نے فرمایا: ''دین پلٹ کر مدینے میں سمٹ آئے گا۔''اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوسکے گا جب وہاں دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو نہ رہنے دیا جائے۔واللہ اعلم!''

بطور تلخیص ان تمام اقوال کوتین میں منحصر کیا جاسکتا ہے:

قول اول: وہ خطۂ زمین جو اَز روئے حقیقت جزیرۂ عرب سے موسوم ہے۔عام علمائے اسلام کا یہی موقف ہے، یہی لفظ سے ظاہر ہے، البتہ! جزیرۂ عرب کی تحدید میں علماے جغرافیہ کے جزوی اختلافات ہیں۔

قول دوم: خاک حجاز،جس میں مکہ، مدینہ، یمامہ اوران کے اطراف داخل ہیں۔یہ شوافع کا مذہب ہے۔

قول سوم: مدینہ منورہ اور یہ امام مالک کا قول ضعیف ہے۔

ان میں قول دوم ہی اقرب الی الصواب معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ اس کی وضاحت اوپر ہوچکی۔اس اعتبار سے ''جزیرۃ العرب'' سے ''ارض حجاز'' مراد لینا ''کل بول کر جزءِ اہم

---

(۱)حجۃ اللہ البالغۃ: ۲/۲۷۶

مراد لینے‘‘ کے باب سے ہوا اور ایسا استعمال ہر زبان میں رائج ہے۔(۱)

مشرکین سے کون مراد ہیں؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ مذکورہ احادیث میں مشرکین سے مراد کون لوگ ہیں؟ اس کے جواب میں محدث ابوالعباس قرطبی نے لکھا ہے کہ یہاں مشرکین سے مراد یہود ہیں۔ اس لیے کہ اس وقت سرزمین عرب پر اُن کے علاوہ کوئی دوسرا مشرک نہیں بچا تھا۔ لہٰذا وہی متعین ہوئے۔ ایک دوسری روایت اس کی تفسیر بھی کر رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَخْرِجُوْا الْيَهُوْدَ مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ یہود کو جزیرۂ عرب سے نکال دو۔(۲)

اسی مفہوم کی یہ حدیث پاک بھی ہے:

لَأُخْرِجَنَّ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارىٰ مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ حَتّٰى لَا أَدَعَ إِلَّا مُسْلِمًا۔

’’میں یہود و نصاریٰ کو ضرور جزیرۂ عرب سے نکال دوں گا اور سوائے مسلمانوں کے یہاں کسی کو نہیں رہنے دوں گا۔‘‘ (صحیح مسلم، ۱۷۶۷)

جزیرہ نمائے عرب سے غیر مسلموں کے اخراج کا مفہوم

اب رہا یہ سوال کہ جزیرۂ عرب سے غیر مسلموں کو نکالنے سے مراد کیا ہے؟ اس کے

---

(۱) لفظ بول کر اس کا کوئی ایسا معنی مراد لینا جو اس کا معنی موضوع لہ نہ ہو، بلاغت کی اصطلاح میں اسے مجاز کہتے ہیں، پھر معنی حقیقی اور معنی مجازی میں اگر تشبیہ کا رشتہ ہو تو اسے استعارہ کہتے ہیں، بصورت دیگر اسے مجاز مرسل کہتے ہیں۔ مجاز مرسل کی بہت سی صورتیں ہیں۔ انہیں میں ایک صورت یہ ہے کہ کل بول کر جزء مراد لیا جائے۔ جیسے کوئی کہتا ہے کہ میں ٹرین پر سوار ہو کر آیا، لیکن اس کی مراد ٹرین کی ایک مخصوص سیٹ ہوتی ہے، نہ کہ کل ٹرین۔ درج ذیل اشعار سے اسے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے:

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

یہاں انگلی سے مراد انگلی کی پور ہے، یعنی شاعر نے یہاں کُل (اُنگلی) بول کر جزو (پور) مراد لیا ہے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

یہاں بھی شاعر نے کُل (بازار) بول کر جزو (ایک دکان) مراد لیا ہے۔

(۲) المفهم لما أشكل من تلخيص كتاب مسلم، الوصايا والفرائض، باب ما أوصى به النبي ﷺ

جواب میں قاضی عیاض مالکی نے لکھا ہے کہ جزیرۂ عرب سے نکالنے سے مراد ان کی مستقل سکونت ختم کرنا ہے، ورنہ بطور مسافر وہ آ جا سکتے ہیں۔ امام مالک اور امام شافعی کا یہی موقف ہے۔ البتہ امام شافعی کے نزدیک یہ حکم صرف ارض حجاز کے لیے ہے جس میں اُن کے نزدیک مکہ، مدینہ اور یمامہ کے علاقے شامل ہیں، چوں کہ جزیرۂ عرب سے ان کی مراد فقط حجاز ہے۔(۱)

اس سلسلے میں احناف کا موقف بھی بہت اہم ہے۔ علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

وَيُمْنَعُوْنَ مِنْ اسْتِيْطَانِ مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةِ لِأَنَّهُمَا مِنْ أَرْضِ الْعَرَبِ قَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: لَا يَجْتَمِعُ فِي أَرْضِ الْعَرَبِ دِيْنَانِ، وَلَوْ دَخَلَ لِتِجَارَةٍ جَازَ وَلَا يُطِيْلُ۔ وَأَمَّا دُخُوْلُهُ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ فَذَكَرَ فِي السِّيَرِ الْكَبِيْرِ الْمَنْعَ، وَفِي الْجَامِعِ الصَّغِيْرِ عَدَمَهُ وَالسِّيَرُ الْكَبِيْرُ اٰخِرُ تَصْنِيْفِ مُحَمَّدٍ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى. (الدر المختار وحاشیۃ ابن عابدین: ۴/ ۲۰۸)

''غیر مسلموں کو مکہ اور مدینے کی شہریت نہیں دی جائے گی، کیوں کہ یہ زمین عرب میں ہیں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: لَا يَجْتَمِعُ فِي أَرْضِ الْعَرَبِ دِيْنَانِ۔ سرزمین عرب پر دو دین نہیں رہیں گے۔ البتہ! بغرض تجارت ان کا آنا درست ہے، تاہم ان کی مدت اقامت طویل نہ رکھی جائے، اور جہاں تک مسجد حرام میں ان کے داخلے کا مسئلہ ہے تو سیر کبیر میں اس سے بھی روکا گیا ہے، مگر جامع صغیر میں اس کی اجازت ہے۔ البتہ! امام محمد کی آخری کتاب سیر کبیر ہی ہے۔''

علامہ شامی نے اس پر حاشیہ لگاتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں طویل مدت سے مراد ایک سال ہے۔ علامہ شامی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہاں ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ مسجد حرام میں ان کا عدم داخلہ ہی احناف کا مذہب معتمد ہے، حالاں کہ حنفی متون میں اس کی اجازت منقول ہے۔ اب تطبیق کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کہا جائے کہ امام محمد کا مذہب معتمد عدم جواز ہے، جب کہ امام ابو حنیفہ کا صحیح موقف جواز کا ہے۔(۲)

---

(۱) إِكمَالُ المُعْلِمِ بفَوَائِدِ مُسْلِم، کتاب الوصیۃ، باب ترک الوصیۃ لمن لیس لہ شیء یوصی فیہ
(۲) (الدر المختار وحاشیۃ ابن عابدین: ۴/ ۲۰۸)

حرم مکہ میں غیر مسلموں کا داخلہ؟

واضح رہے کہ امام شافعی اور دیگر ائمہ کے نزدیک حرم مکہ میں مطلقاً مشرکین کا داخلہ ممنوع ہے، ان کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ﴿٢٨﴾ (توبہ)

''یقیناً مشرکین ناپاک ہیں، لہٰذا وہ اس سال کے بعد مسجد حرام سے قریب نہ ہوں۔''

اس کے برخلاف مذہب ابوحنیفہ میں مشرکین حرم مکہ میں بھی داخل ہو سکتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نجاست، حسی نہیں ہے، بلکہ معنوی اور اعتقادی ہے۔ مزید یہ کہ سورۂ براءت کے نزول کے بعد بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد ثقیف کو اپنی مسجد میں ٹھہرایا۔ اگر وہ ناپاک ہوتے تو مسجد میں نہیں ٹھہرائے جاتے۔ اس لیے آیت مذکورہ کو اَحناف نے بطور تغلب داخلہ پر محمول کیا ہے۔ یعنی وہ فاتحانہ شان کے ساتھ یہاں داخل نہیں ہو سکتے۔ حرم پاک اہل اسلام کا خاص دینی وروحانی مرکز ہے۔

سرزمین عرب پر غیر اسلامی معابد کا وجود؟

اس باب کا ایک اہم مسئلہ سرزمین عرب پر دیگر مذاہب کے معابد کی تعمیر یا بقا کا ہے۔ چوں کہ پیغمبر علیہ السلام نے فرمادیا ہے کہ جزیرۂ عرب میں دو دین نہیں رہیں گے، اس لیے اس زمین پر دیگر مذاہب کے معابد کی تعمیر یا بقا کا بھی سوال نہیں ہوتا۔ البتہ! چوں کہ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک اس سے مراد حجاز ہے، اس لیے ان کے نزدیک یہ حکم بھی حجاز کے ساتھ خاص ہے۔

جزیرہ نمائے عرب سے غیر مسلموں کے اخراج کی حکمت

اس سلسلے میں اب آخری سوال ''کیوں؟'' کا رہ جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیوں فرمایا؟ اس ارشاد کی حکمت ومصلحت کیا ہے اور اس کی عقلی توجیہ کیا بنتی ہے؟ کیا حضور کا ایسا فرمانا -معاذ اللہ!- غیر مسلموں کے حوالے سے ظلم یا تشدد پر مبنی ہے؟ اور کیا اس کی وجہ سے اسلام کے فلسفۂ جنگ -ظلم وجبر کے خاتمہ- پر حرف آتا ہے؟

واضح رہے کہ اس باب میں جو بھی احادیث وارد ہیں، ان میں یہ مذکور نہیں ہے کہ جزیرۂ عرب میں جو بھی غیر مسلم ہوں، اُنہیں قتل کر دیا جائے، نہ یہ ہے کہ اُنھیں زبردستی

مسلمان بنالیا جائے، بلکہ اس باب کی احادیث سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو یہود یہاں رہ گئے ہیں، جو آئے دن اسلامی ریاست کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں، انہیں جزیرہ نمائے عرب سے باہر کر دیا جائے۔ فی الواقع مشرکین کے نکالنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا، اس لیے کہ امام بخاری (۱) کے مطابق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حکم اپنے آخری وقت (ربیع الاول ۱۱ھ) میں دیا تھا، جب کہ اس وقت سر زمین عرب پر مشرکین تھے ہی نہیں، جیسا کہ علامہ قرطبی نے لکھا ہے (۲) اور علامہ ابن قیم کے بقول غزوۂ تبوک (رجب ۹ھ) کے وقت ہی عرب میں کوئی مشرک نہیں تھا۔ (۳) پھر دو سال بعد ربیع الاول ۱۱ھ میں انہیں عرب سے نکالنے کے کیا معنی ہو سکتے تھے؟

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب المغازي، باب: مرض النبي صلى الله عليه وسلم ووفاته

(مسند احمد (۲۶۳۵۲) کے مطابق یہ حدیث بھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری وصیت ہے: لَا يُتْرَكُ بِجَزِيرَةِ الْعَرَبِ دِينَانِ۔ جزیرۂ عرب میں دو دین باقی نہیں رہیں گے۔ لہٰذا اس حدیث کو بھی اخراج مشرکین والی حدیث کے تناظر میں ہی سمجھا جانا چاہیے۔

(۲) المفهم لما أشكل من تلخيص كتاب مسلم، الوصايا والفرائض، باب ما أوصى به النبي صلى الله عليه وآله وسلم

(۳) زاد المعاد: ۵ / ۸۳

آٹھواں سوال

کیا تمام مشرکین کے خلاف جنگ ضروری ہے؟

اسلام کے فلسفۂ جنگ کے حوالے سے درج ذیل آیت کریمہ سے بھی بعض حضرات نے استدلال کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ صرف ظلم وفساد کے خاتمہ کے لیے ہی نہیں، بلکہ یوں بھی تمام مشرکین سے جنگ کی جائے گی۔ آیت کریمہ یہ ہے:

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً (توبہ:۳۶)

جس طرح یہ مشرکین تم سب سے جنگ کر رہے ہیں، تم بھی ان سب سے جنگ کرو۔

عربی زبان کا ایک معمولی طالب علم بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہاں پر:

۱۔ المشرکین کے ساتھ جنگ کی بات کی گئی ہے۔ عربی زبان میں ''ال'' انگریزی زبان کے حرف تعریف The کے قریب المعنی ہوتا ہے۔ عام طور پر جب یہ کسی لفظ پر لگ جاتا ہے تو اس کے اندر ایک مخصوص مفہوم پیدا کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہاں المشرکین سے مراد صرف وہ مشرکین ہوں گے جو اس کلام کے سیاق (context) میں مفہوم ہیں۔

۲۔ اسی آیت میں اس بات کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ وہ مخصوص مشرکین کون سے ہیں۔ كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً سے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ یہاں وہ تمام مشرکین مراد ہیں، جنہوں نے پہلے سے رسول اور اصحاب رسول کے ساتھ جنگ برپا کر رکھی تھی۔

یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ اس آیت کریمہ میں صرف ان مشرکین سے جنگ کرنے کا حکم ہے جو محارب بالفعل یا فی الواقع آمادۂ جنگ ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ محارب بالفعل کون سے مشرک ہیں؟ یہاں عقلی طور پر حسب ذیل امکانات پیدا ہوتے ہیں:

۱۔صرف وہ مشرکین مراد ہیں جو میدان جنگ میں سیف وسنان کے ساتھ نکل پڑیں یا جو حملے کی تیاری میں ہوں؟

۲۔یا اس کے ذیل میں وہ تمام مشرکین شامل ہیں، جو اس وقت عرب میں موجود تھے؟

۳۔یا ذمی کے علاوہ دنیا کے دیگر تمام مشرکین، اگر چہ وہ آمادۂ جنگ نہ ہوں۔

پہلی قسم سے جنگ کا جواز تو یقیناً عقلی بدیہی ہے۔ مذکورہ بالا آیت درحقیقت ایسے ہی مشرکین کے خلاف جنگ کے جواز پر نص ہے۔

رہے دوسری قسم کے مشرکین تو مفسرین کی ایک جماعت اس طرف بھی گئی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ مشرکین عرب کے لیے صرف دو ہی آپشن تھے، اسلام یا پھر تلوار۔(۱) یہ رائے خلاف تحقیق ہے۔اس پر تفصیلی بحث اس سے پہلے ''ساتواں اعتراض'' کے ذیل میں گزر چکی۔

رہے تیسری قسم کے مشرکین، تو مفسرین کی ایک جماعت ان سے بھی جنگ کے جواز کی طرف گئی ہے۔ یہ وہی گروہ ہے جو مطلقاً کفر کو علتِ قتال سمجھتا ہے۔اس گروہ کے مطابق اب امن وسلام کے سارے نصوص منسوخ ہیں اور آیت کریمہ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً کے سبب دنیا جہان کے مشرکین سے جنگ جائز ہے۔گذشتہ صفحات میں تفصیل سے ان کی تردید کی جا چکی ہے۔

بہرکیف! تمام غیر مسلموں سے جنگ کو درست سمجھنا، یہ انتہائی خطرناک اور غیر انسانی نظریہ ہے، جس کی تردید کسی قدر تفصیل کے ساتھ ''پہلا سوال-کیا اسلام کفر کے خلاف جنگ چاہتا ہے؟'' کے ذیل میں گزر چکی۔ یہاں التفسير القرآني للقرآن کے مصنف ڈاکٹر عبد

---

(۱) یہ فکر اسلامی مزاج سے کس قدر بعید ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مطعم بن عدی نے کئی مواقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے ساتھ حسن سلوک کیا تھا، لیکن ایمان نہیں لائے تھے۔ جنگ بدر کے دن جب مکہ کے قیدی گرفتار کر کے پیغمبر کے سامنے لائے گئے تو آپ نے مطعم بن عدی کو یاد کیا اور کہا کہ مطعم آج زندہ ہوتے اور ان قیدیوں کی رہائی کے لیے سفارش کرتے تو ضرور میں ان کی سفارش قبول کر لیتا۔لَو كان مُطعِمُ بنُ عَدِيّ حيّاً ثم كلّمني في هؤلاءِ النَّتنَى لأطلقتُهم له (سنن ابی داؤد، ح:۲۶۸۹) واضح رہے کہ جنگ بدر اسلام کی بقا کی جنگ تھی، جس سے پہلے دعا کرتے ہوئے پیغمبر نے کہا تھا: مولیٰ! اگر مسلمانوں کی یہ چھوٹی جماعت آج ہلاک ہوگئی پھر زمین پر تیری عبادت نہیں ہو سکے گی۔(اللَّهُمَّ! إِنْ تُهْلِكْ هَذِهِ الْعِصَابَةَ مِنْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ لَا تُعْبَدْ فِي الْأَرْضِ، صحیح مسلم، ح:۱۷۶۳)

الکریم الخطیب (۱۹۸۵ء) کا یہ تبصرہ پڑھیے۔ موصوف لکھتے ہیں:

''غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کا موقف یہ ہے کہ جو امن چاہیں ان کے ساتھ امن قائم کیا جائے اور جو جنگ وسرکشی پر آمادہ ہوں، ان کے ساتھ جنگ کی جائے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے شروع ہونے والی اسلامی دعوت کی تاریخ اور اس کا اسلوب اول روز سے انہیں خطوط پر قائم ہے، جنہیں اِن آیات قرآنیہ نے کھینچا ہے:

ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ. (النحل:۱۲۵)

حکمت، اچھی نصیحت اور اچھے مکالمہ کے ذریعے اپنے رب کی راہ کی دعوت دو۔

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (العنکبوت:۴۶)

اہل کتاب کے ساتھ اچھے طریقے سے مکالمہ کرو۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ (الاعراف:۱۹۸)

معاف کرو، بھلائی کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔

یہ اور اس قسم کی آیات، آیات محکمات ہیں۔ مسلمانوں کے اپنے باہمی اور دوسری غیر مسلم اقوام کے ساتھ انسانی روابط انہیں آیات کی بنیاد پر قائم ہیں۔ خواہ وہ مسلم ریاست کے غیر مسلم شہری ہوں، دارالحرب کے ہوں، یا کسی تیسری نوعیت کی ریاست کے ہوں۔ بھلا یہ اسلام کا نظریہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کے خلاف جنگ کا آغاز نہ کریں، ان کے خلاف بھی جنگ کا اعلان کر دیا جائے۔ کیا یہ سرکشی نہیں ہے، جس سے اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات قرآنیہ میں منع فرمایا ہے؟[۱] انسانی معاشرے کے خلاف عام اعلان جنگ کرنے والے بھلا اس آیت کریمہ کی کیا تاویل کریں گے؟

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (البقرۃ:۱۹۰) جو لوگ تم سے جنگ کریں، ان سے اللہ کی راہ میں

---

(۱) حد تو یہ ہے کہ قرآن ظالموں کے خلاف کارروائی کرتے وقت بھی عدل کے تقاضوں سے انحراف کو درست نہیں سمجھتا۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى [المائدۃ:۸]

جنگ کرو اور حد سے نہ بڑھو، بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

ان حضرات کے پاس اس آیت کی کوئی تاویل نہیں، سوائے اس کے کہ اسے منسوخ قرار دیں اور اس قسم کی آیات کے حکم کو باطل کر دیں۔۔۔

پھر یہ کہ یہ کون سا دین ہے جس میں تلوار کے سائے میں لوگوں کو جبراً وقہراً داخل کرایا جاتا ہے اور کیا ایسا دین انسان کے دل کو آباد اور وجدان کو سرشار کر سکتا ہے؟ چلیے کسی سیاسی یا معاشرتی دعوت میں اس کے لیے ایک گنجائش مانی بھی جا سکتی ہے، لیکن ایک آسمانی دین میں تو اس کی ہرگز گنجائش نہیں ہو سکتی اور اگر کسی محدود وقفے کے لیے، کسی محدود معاشرے میں، کسی اور آسمانی دین میں اس کی گنجائش ہو تو ہو، مگر اسلام جو کہ امتداد زمانہ کے ساتھ، مختلف قوموں اور قبائل میں موجود پوری انسانی زندگی کا دین ہے، اس میں تو اس کی ہرگز گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اس حقیقت کا انکشاف قرآن کا یہ فرمان کرتا ہے: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرۃ: ۲۵۶) دین میں کوئی جبر نہیں، اب ہدایت ضلالت سے ممتاز ہو چکی ہے۔

پھر دوسروں کی طرف سے جنگی پیش رفت کے بغیر اگر مسلمان تمام غیر مسلموں کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں تو ایسی صورت میں اس تقویٰ کے کیا معنی رہ جائیں گے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اسی آیت میں کیا ہے:

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ (توبہ: ۳۶) اور (مشرکین سے جنگ کرتے وقت) یاد رکھو کہ اللہ متقی بندوں کے ساتھ ہے۔ (۱)

خلاصہ یہ کہ اسلام میں جنگ کا حکم اصلاً مشرکین کے خلاف نہیں، بلکہ ظالموں اور فسادیوں کے خلاف ہے۔

(۱) التفسير القرآني للقرآن، سورۃ التوبۃ، آیت: وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ (۳۶)

نواں سوال

کیا لوگوں کو مسلمان بنانے کے لیے جنگ جائز ہے؟

بعض حضرات کفر کے خاتمے کے لیے جنگ کے جواز پر یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں:

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ﴿١٦﴾ (الفتح)

جنگ سے پیچھے رہ گئے اعرابیوں سے کہہ دیں کہ عنقریب تمھیں ایک خطرناک قوم سے جنگ کے لیے بلایا جائے گا، جن سے یا تو تم جنگ کرو گے یا یہ کہ وہ اسلام قبول کرلیں گے۔

اس آیت کریمہ سے اُن کا استدلال واضح ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مستند ائمہ نے اس آیت کی کیا تفسیر کی ہے اور یہ کہ خود قرآنی مزاج، قرآنی سیاق اور قرآن کی دیگر آیات کی روشنی میں اس کی درست تفسیر کیا ہے؟

یہاں کئی سوالات زیر بحث ہیں۔ ان میں پہلا سوال یہ ہے کہ یہ خطرناک قوم (اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ) کون تھی جس سے جنگ کی دعوت اس آیت میں دی گئی ہے۔

تفسیر ابن کثیر کے مطابق اس میں چند آرا ہیں:

١۔ قبیلہ ہوازن، ٢۔ بنو ثقیف، ٣۔ بنوحنیفہ، ۴۔ اہل فارس، ۵۔ روم، ٦۔ فارس وروم، ٧۔ مشرکین، ٨۔ یہ خطرناک لوگ ہیں، جن کی تعیین نہیں کی گئی ہے، ٩۔ زہری کے بقول یہ قوم اب تک ظاہر نہیں ہوئی، ١٠۔ کرد، ١١۔ ترک۔

ابن کثیر نے یہ اقوال نقل کرنے کے ساتھ اُن کے قائلین کی تفصیل بھی دی ہے۔

امام رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ جس خطرناک قوم کی طرف جہاد کی دعوت کی بات کی گئی ہے، اس کی تفسیر میں کئی اقوال آئے ہیں، جن میں سب سے معروف ومشہور اور ظاہر قول (أَشْهَرُهَا وَأَظْهَرُهَا) کے مطابق یہ بنو حنیفہ ہیں جنھوں نے مسیلمہ کذاب کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ کی۔ اس کے علاوہ فارس وروم، ہوازن وثقیف کے نام بھی لیے گئے ہیں۔

علامہ ابوالحسن علی واحدی شافعی نیشاپوری (۴۶۸ھ) نے جو روایت نقل کی ہے، اس سے بھی امام رازی کی مذکورہ بالا رائے کی تائید ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اکثر مفسرین کی رائے یہی ہے کہ اس سے بنو حنیفہ مراد ہیں، جو مسیلمہ کذاب کے متبعین تھے۔ رافع بن خدیج کہتے ہیں کہ ہم یہ آیت پڑھتے تھے، لیکن ہمیں اس بات کی خبر نہیں تھی کہ اس آیت میں خطرناک (أُوْلِي بَأْسٍ شَدِيْدٍ) سے کون سی قوم مراد ہے، پھر جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہمیں بنو حنیفہ سے جنگ کی دعوت دی تب ہم پر راز کھلا کہ وہ خطر ناک قوم یہی تھے۔ (الوسيط في تفسير القرآن المجيد، الفتح:۱۶)

علامہ واحدی کی اس تحقیق کی روشنی میں ۔ جسے رد کرنے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی ۔ واضح ہوتا ہے کہ اسلام یا جنگ کا یہ فلسفہ باغیوں کی سرکوبی کے لیے ہے۔ یہ اسلامی ریاست کے باغی تھے اور باغی بھی ایسے کہ اس کے مقابل متوازی نبوت وریاست کی دیوار کھڑی کر رہے تھے۔ قرآن کی تعبیر کے مطابق یہ واقعی خطرناک (أُوْلِي بَأْسٍ شَدِيْدٍ) تھے۔ چالیس ہزار کا لشکر جرار اِسلام اور مسلمانوں کے صفایا کے لیے تیار تھا۔ یہ تعصب، جنون اور سرکشی میں پاگل لوگ تھے جو پیغمبر اسلام کی صداقت اور مسیلمہ کذاب کے جھوٹ کو جانتے بوجھتے بھی صرف اس لیے کھڑے ہو گئے تھے کہ بقول اُن کے، بنو ربیعہ کا جھوٹا نبی بنو مضَر کے سچے نبی کے بہ نسبت اُنھیں زیادہ عزیز تھا۔

كَذَّابُ رَبِيْعَةَ أَحَبُّ إِلَيْنَا مِنْ صَادِقِ مُضَر۔ (۱)

یمامہ کے بنو حنیفہ نے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ اسلام کے لیے آنے والوں میں مسیلمہ بھی تھا۔ اس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کے لیے یہ شرط رکھی کہ جس طرح حضرت موسیٰ نے ہارون کو نبوت میں شریک کیا تھا اسی طرح آپ بھی مجھے شریک کریں۔

---

(۱) تاریخ طبری: ۲/ ۲۷۷، ابن اثیر: ۱/ ۳۷۳

حضور نے ایمان بالنبوۃ کے لیے اس غیر معقول شرط کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا۔ بعد میں اس شخص کی تحریک پر اہل یمامہ مرتد ہو گئے اور انھوں نے ریاست کے خلاف بغاوت کر دی۔ صدیق اکبر نے سب سے پہلے حضرت عکرمہ اور شرحبیل کو بھیجا جو شکست سے دو چار ہوئے۔ پھر خالد بن ولید کو بھیجا جنھوں نے بڑی مشکلوں سے شکست کو فتح میں بدلا۔

دنیا جانتی ہے کہ باغیوں کی سزا قتل ہوتی ہی ہے، یہاں اُن کے لیے یہ آسانی بھی رکھی گئی کہ اسلامی شریعت وریاست کو اگر وہ قبول کر لیتے ہیں تو اس بغاوت اور سرکشی کے باوجود بھی اُنھیں معافی مل جائے گی۔ یہ تو نسبتاً آسان آپشن تھا۔ آیت کریمہ کے اُس خاص تناظر کو نظر انداز کر کے اُسے عمومی جنگ بالجبر یا جنگ برائے شوکت واقتدار کے جواز میں بھلا کیسے پیش کیا جا سکتا ہے؟

رہی یہ بات کہ زیر بحث آیت کی جو دوسری تفاسیر ہیں، اُن کے مطابق اسلامی فلسفۂ جنگ کی درست تعبیر کیا ہوگی؟

اس سلسلے میں عرض ہے کہ اس آیت میں جس قوم سے جنگ کی دعوت دی گئی ہے، اس سیاق میں مفسرین نے بنو حنیفہ کے بعد سب سے زیادہ ہوازن اور ثقیف کا نام لیا ہے، جن سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام حنین میں جنگ کی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین میں ان تمام لوگوں کو قتل کرا دیا جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا، یا آپ نے اُنھیں اسلام کے علاوہ بھی جینے کا آپشن دیا تھا؟

تاریخ بتاتی ہے کہ یہ جنگ فتح مکہ کے بعد شوال ۸ھ میں پیش آئی تھی۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ جہاں ایک طرف فتح مکہ کو دیکھ کر فوج در فوج قبائل عرب اسلام میں داخل ہونے لگے تھے، وہیں بعض قبائل پر اس کا منفی اثر بھی ہوا اور اُنھوں نے اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب رحمت کے آگے بند باندھنے کی قسم کھالی۔ ہوازن، ثقیف اور بعض دیگر قبائل کا نام اس سیاق میں لیا جا سکتا ہے۔ ہوازن کا سردار مالک بن عوف ان کی سربراہی کر رہا تھا۔ وہ تیس ہزار فوجیوں پر مشتمل ایک لشکر جرار لے کر اپنی بیویوں، بچوں اور تمام تر مال واسباب کے ساتھ نکلا اور مکہ کے قریب پہنچ گیا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اُس نے اسلام کے یا اپنے خاتمے کا تہیہ کر لیا ہے۔

پیغمبر رحمت صلی اللہ علیہ وسلم بارہ ہزار فوج لے کر مقابلے کے لیے نکلے۔ یہ مسلمانوں کا اب تک کا سب سے بڑا لشکر تھا۔ بعض مسلمانوں کے اندر اپنی تعداد پر اعتماد اور افتخار کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو پہلے مرحلہ میں بظاہر شکست کا سامنا کرنا پڑا، یہاں تک کہ مسلم فوج منتشر ہوگئی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تنہا رہ گئے، پھر آپ نے انصار و مہاجرین کو آواز دی۔ سب لبیک کہتے ہوئے جمع ہوئے اور بالآخر اللہ نے اپنے آخری پیغمبر کی دست گیری فرمائی اور ظاہری شکست فتح میں بدل گئی۔ اس واقعے کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے:

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ أَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ﴿٢٦﴾ (توبہ: ۲۵،۲۶)

جنگ حنین کے دن جب تمہاری کثرت تعداد نے تمھیں تکبر میں مبتلا کر دیا، لیکن تمہاری کثرت تمہارے کسی کام نہ آئی، یہاں تک کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم اپنی پشت دکھا کر بھاگ نکلے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور اہل ایمان پر سکینہ نازل فرمایا، تمہاری مدد کے لیے ایسی فوج اتاری جسے تم نہیں دیکھ سکتے اور منکر سرکشوں کو کیفر کردار تک پہنچایا اور سرکشوں کی یہی سزا ہے۔

الغرض! پیغمبر علیہ السلام فتح یاب ہوئے، ستر سے زائد مشرکین کے بالمقابل صرف چار مسلمان شہید ہوئے۔ بے حساب اموال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ تقریباً ہزار گھوڑ سوار قیدی بنا کر لائے گئے۔ قیدیوں میں آپ کی رضاعی بہن شیما بنت حلیمہ بھی تھیں۔ آپ نے اُن کو دیکھا تو اپنی چادر بچھا دی، اُنھیں اس پر بٹھایا اور اُن سے حال احوال پوچھنے لگے۔ آپ نے شیما سے دریافت فرمایا:

''اگر آپ ہمارے ساتھ رہنا چاہیں تو عزت و شرف کے ساتھ رہیں اور اگر آپ اپنے قبیلہ لوٹنا چاہیں تو لوٹ جائیں۔''

حضرت شیما نے دوسرا آپشن اختیار کیا۔ آپ نے اُنھیں انعام واکرام کے ساتھ لوٹا دیا۔ لوٹتے ہوئے آپ مشرف بہ اسلام بھی ہوگئیں۔ فریق مخالف کا سپہ سالار مالک بن عوف بھی مسلمان ہوا اور ہوازن کے دوسرے لوگ بھی مسلمان ہوئے اور ان کے قیدی آزاد کردیے گئے۔ قیدیوں کی آزادی کی جو تفصیل ہے، ذرا اُسے الرحیق المختوم کے حوالے سے پڑھیے:

''غنیمت تقسیم ہوجانے کے بعد ہوازن کا وفد مسلمان ہوکر آ گیا۔ یہ کل چودہ آدمی تھے۔ ان کا سربراہ اور خطیب زُہیر بن صُرَد تھا اور ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رضاعی چچا ابو برقان بھی تھا۔ وفد نے سوال کیا کہ آپ مہربانی کر کے قیدی اور مال واپس کردیں اور اس انداز کی بات کی کہ دل پسیج جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے ساتھ جو لوگ ہیں اُنھیں دیکھ ہی رہے ہو اور مجھے سچ بات زیادہ پسند ہے۔ اس لیے بتاؤ کہ تمھیں اپنے بال بچے زیادہ محبوب ہیں یا مال؟ اُنھوں نے کہا: ہمارے نزدیک خاندانی شرف کے برابر کوئی چیز نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا تو جب میں ظہر کی نماز پڑھ لوں تو تم لوگ اُٹھ کر کہنا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مومنین کی جانب سفارشی بناتے ہیں اور مومنین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سفارشی بناتے ہیں کہ آپ ہمارے قیدی ہمیں واپس کردیں۔ اس کے بعد جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو ان لوگوں نے یہی کہا۔ جواباً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہاں تک اس حصے کا تعلق ہے جو میرا ہے اور بنی عبدالمطلب کا ہے تو وہ تمہارے لیے ہے اور میں ابھی لوگوں سے پوچھے لیتا ہوں۔ اس پر انصار اور مہاجرین نے اٹھ کر کہا: جو کچھ ہمارا ہے وہ سب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ اس کے بعد اَقرَع بن حابس نے کہا: لیکن جو کچھ میرا اور بنو تمیم کا ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نہیں، اور عُیَینہ بن حصن نے کہا کہ جو کچھ میرا اور بنو فزارہ کا وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نہیں ہے، اور عباس بن مرداس نے کہا: جو کچھ میرا اور بنو سلیم کا ہے وہ بھی آپ ﷺ کے لیے نہیں ہے۔ اس پر بنو سلیم نے کہا: جی نہیں، جو کچھ ہمارا ہے وہ

بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ عباس بن مرداس نے کہا: تم لوگوں نے میری توہین کر دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دیکھو! یہ لوگ مسلمان ہو کر آئے ہیں (اور اُسی غرض سے) میں نے اُن کے قیدیوں کی تقسیم میں تاخیر کی تھی، اور اب میں نے اُنھیں اختیار دیا تو اُنھوں نے بال بچوں کے برابر کسی چیز کو نہیں سمجھا۔ لہٰذا جس کسی کے پاس کوئی قیدی ہو، اور وہ بخوشی واپس کر دے تو یہ بہت اچھی راہ ہے اور جو کوئی اپنے حق کو رُوکنا ہی چاہتا ہو تو وہ بھی ان کے قیدی تو اُنھیں واپس ہی کر دے۔ البتہ! آئندہ جو سب سے پہلا مالِ فے حاصل ہوگا اُس سے ہم اُس شخص کو ایک کے بدلے چھ دیں گے۔ لوگوں نے کہا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بخوشی دینے کو تیار ہیں۔ آپ نے فرمایا: ہم نہیں جان سکے کہ آپ میں سے کون راضی ہے اور کون نہیں؟ لہٰذا آپ لوگ واپس جائیں، اور آپ کے چودھری حضرات آپ کے معاملے کو ہمارے سامنے پیش کریں۔ اس کے بعد سارے لوگوں نے اُن کے بال بچے واپس کر دیے۔ صرف عُیینہ بن حصن رہ گیا جس کے حصے میں ایک بڑھیا آئی تھی۔ اُس نے واپس کرنے سے انکار کر دیا، لیکن آخر میں اس نے بھی واپس کر دیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے قیدیوں کو ایک ایک قبطی چادر عطا فرما کر واپس کر دیا۔'' (الرحیق المختوم: ۵۷۲، ۵۷۳)

اب یہاں پہنچ کر زیر بحث آیت کے الفاظ کو دوبارہ دیکھیں۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے:

سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ

(عنقریب تمھیں ایک خطرناک قوم سے جنگ کے لیے بلایا جائے گا)

حق تعالیٰ نے اس بندۂ آثم کے قلب پر روشن فرمایا کہ آیت کریمہ کے یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ یہ جنگ مسلمانوں کی مجبوری ہوگی، اُن پر مسلط کی جائے گی، خود مسلمان اُس جنگ میں پہل نہیں کریں گے۔ اسی طرح اِن الفاظ کو دیکھیں:

تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ

(جن سے یا تو تم جنگ کرو گے یا یہ کہ وہ اسلام قبول کر لیں گے۔)

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ آپشن جنگ یا اسلام میں ہوگا، قتل یا اسلام میں نہیں ہوگا۔ یعنی وہ قوم ایسی خطرناک ہوگی کہ اس کے اندر جب تک دم ہوگا وہ تمہارے ساتھ جنگ کرتی رہے گی اور جب بالکل بے بس ہو جائے گی تو اِسلام قبول کر لے گی۔

اس آیت کریمہ میں اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ:

۱۔ وہ سپر انداز ہو جائے تو تم اُسے اسلام کے لیے مجبور کرنا اور عدم قبول کی صورت میں اُسے قتل کر دینا۔

۲۔ نہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے۔

اگر آیت کریمہ کا منشا یہی ہوتا تو پھر آپ پکڑے گئے لوگوں کو اس عہد کے عام رواج کے مطابق غلام نہیں بناتے، بلکہ اُن کے سامنے اسلام پیش کرتے اور اُن میں جو اسلام قبول کرتا اُسے چھوڑ دیتے، باقی کو قتل کرا دیتے۔ حالاں کہ قانونی طور پر بھی ان کا قتل جائز تھا، کیوں کہ یہ اسلامی ریاست کے خلاف بغاوت اور اِعلان جنگ کے مرتکب تھے اور باغیوں اور ملک پر حملہ آوروں کو قتل کرنا بین الاقوامی اصولوں کے مطابق کل بھی جائز تھا اور آج بھی جائز ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ قرآن اور سیرت کے ایسے شفاف اوراق سے بعض حضرات نے خاتمۂ کفر کے لیے جنگ کے جواز کو کیسے ثابت کر دیا ہے، جب کہ ان کا حرف حرف پکار رہا ہے کہ اسلام میں جنگ کا حکم کفر مٹانے کے لیے نہیں، بلکہ ظلم اور فساد مٹانے کے لیے ہے۔

❁❁❁

دسواں سوال

صحابہ نے دیگر اقوام سے جنگ کیوں کی؟

اسلام اگر تلوار کے زور سے نہیں پھیلا تو پھر مسلمانوں نے پوری دنیا کے خلاف تلوار کیوں اٹھائی؟ اسلامی فلسفۂ جنگ کے خلاف یہ سب سے معروف اور بڑا سوال سمجھا جاتا ہے، جس کا جواب انتہائی متانت، تحقیق اور انصاف سے دینے کی ضرورت ہے۔ سردست مولانا محمد یحییٰ نعمانی کی ایک تحریر ''اسلام کا تصور جہاد۔ چند توضیحات'' سے ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے جو اختصار اور بصیرت کے ساتھ اس مسئلے کے اہم گوشوں کی وضاحت کرتا ہے:

''**رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جنگوں کی نوعیت**

قرآن ہی نہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت و سنت اور آپ کی دس سالہ مدنی زندگی کی جنگوں کا حال دیکھ لیجیے آپ نے کسی صلح پر آمادہ طاقت سے جنگ نہیں کی۔

ا۔ مکہ والوں کے بارے میں قرآن نے بارہا صراحت کی کہ اُنھوں نے جنگ چھیڑ رکھی ہے: وَهُمْ بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (اُنھوں نے ہی ابتداء جنگ کی ہے) یہ بھی کہا کہ وہ زیادتی اور ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں: وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ۔ تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ مکہ میں مظالم اور مذہبی جبر کے اس دور کے بعد، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو گھر بار، مال اور اولاد چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی، وہ مدینہ پر حملے میں بھی ابتدا کر چکے تھے۔ ان کے حملہ آور مدینہ پر شب خون اور لوٹ کی کاروائیاں کرتے رہتے تھے۔ مزید اُنھوں نے، سنن ابوداؤد (رقم: ۳۰۰۴) کی صحیح روایت کے مطابق، مدینہ میں یہود کو اور غیر مسلم عربوں کو بھی مسلمانوں سے

لڑانے اور اُن کے اخراج پر آمادہ کرنے کے لیے دھمکی آمیز خطوط لکھے۔ اُنھوں نے عرب کی زمین مسلمانوں پر ایسی تنگ کر رکھی تھی کہ غریب مہاجرین تجارت کے لیے۔ جس کے علاوہ اُن کے پاس کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا۔ مدینہ سے نکل تک نہیں سکتے تھے۔ اس طرح مسلمان ایک طرح جیل میں اور معاشی حصار میں زندگی گذارنے پر مجبور تھے۔ (البقرة: ۲۷۳) اِس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے خلاف جنگی کارروائیاں شروع فرمائیں۔

اس کے باوجود اُن سے صلح پر آپ کی آمادگی کا یہ حال کہ آپ نے ایک مرتبہ یہ تک فرمایا:

لا یسالونی خطة یعظمون فیھا حرمات اللہ الا اعطیتھم ایاھا۔

یعنی قریش مجھ سے جو بھی صلح کی شرط رکھیں گے، اگر اللہ کی حرمات کا خیال رکھا جائے گا تو میں انہیں ضرور قبول کرلوں گا۔ (صحیح بخاری، رقم: ۲۷۳۴)

۲۔ مدینہ کے یہودی قبائل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست کے معزز اور باحیثیت شہریوں کی طرح رکھا۔ ریاست کا جو دستور لکھا گیا اُس میں یہود کے قانونی امتیازات اور حقوق و فرائض کا پورا تذکرہ کیا گیا تھا۔ یہود نے اُس کو قبول کر کے اسلامی ریاست اور اُس کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے رسول اللہ کو قبول کیا تھا۔ مگر سب سے پہلے بنی قینقاع نے علانیہ معاہدہ توڑا، بغاوت کی اور جنگ کا اعلان کیا۔ (سیرت ابن ہشام، طبقات ابن سعد)

پھر بنونضیر نے غداری کی انتہا یہ کی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو (معاذ اللہ) دھوکہ سے قتل کرنا چاہا، سازش کا انکشاف ہوگیا مگر آپ نے بھی تحمل کی انتہا کر دی۔ اُن کو سزا دینے کے بجائے مہلت دینے کا ارادہ فرمایا، اور اُن سے کہا کہ اب تم پر اس کے بغیر اِطمینان نہیں کیا جا سکتا کہ تم اَزسرِنو معاہدہ لکھو۔ مگر وہ تو آمادۂ جنگ تھے، معاہدہ صلح پر آمادہ نہیں ہوئے۔ جب کہ بنی قریظہ نے معاہدہ کی تجدید کی۔ پھر آپ نے بنی نضیر پر لشکرکشی فرمائی۔ (سنن ابی داؤد، باب خبر بنی النضیر)

بنی قریظہ کی عہد شکنی بلکہ غزوۂ خندق کے نازک ترین موقع پر حملہ آوروں اور فوجوں کا مدینہ کے اندر سے ساتھ دینا اور حملہ میں شرکت معروف ہے۔

۳۔قرآن کی صراحت اور تاریخ کی تصدیق ہے کہ عرب کے مشرک قبائل سب مسلمانوں کے خلاف آمادۂ پیکار تھے اور قریش کے ساتھ تھے۔قرآن نے اُن کے بارے میں کہا ہے: وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً ﴿۳۶﴾ (توبہ) اور تمام مشرکین سے جنگ کرو اِس لیے کہ وہ سب کے سب تم سے جنگ کر رہے ہیں۔

نجد کے قبائل عکل وعرینہ اور بنوسلیم کی سنگین غداریاں اور خونچکاں حرکتیں معروف ہیں، بنومصطلق جن پر آپ نے اچانک حملہ کیا تھا، وہ پہلے سے محارب تھے، اُحد میں اہل مکہ کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کیا تھا۔پھر اُن کے سردار کے بارے میں یہ اطلاع آئی کہ وہ مدینہ پر حملے کے لیے فوجیں جمع کر رہا ہے۔آپ نے بریدہ بن الحصیب الاسلمی کو تصدیق کے لیے بھیجا، وہ خود سردار قبیلہ حارث ابن ابی ضرار سے ملے اور اُسی سے تیاریوں کی تصدیق کر لی، جب تحقیق ہوگئی تو آپ نے حملہ فرمایا۔
(طبقات بن سعد، ۲/ ۶۳، وسیرت ابن ہشام)

۴۔شمال عرب کی مہمات کی تفصیل ۔۔۔سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن طاقتوں کے خلاف جو جنگ کی تھی [جیسے جنگ تبوک اور جنگ موتہ] وہ اُن کے محاربہ کے نتیجے میں تھی، آپ نے کسی صلح جو اور اَمن پر آمادہ طاقت کے خلاف قطعاً جنگ نہیں کی۔

ابن تیمیہ اور ابن قیم کی صراحتیں

امام ابن تیمیہ اپنے رسالہ ''قاعدة فی قتال الکفار**'' میں کہتے ہیں:** وکانت سیرته ﷺ أن کل من هادنه من الکفار لا یقاتله، وهذه کتب السیرة والحدیث والتفسیر والفقه والمغازی تنطق بهذا وهو متواتر من سیرته. **(ص:۱۳۴) یعنی آپ کی سیرت کی شہادت ہے کہ آپ سے جن کفار نے صلح کی آپ اُن سے جنگ نہیں کرتے تھے، یہ سیرت کی کتابیں ہیں، یہ حدیث وتفسیر اور فقہ وتاریخ کی کتابیں ہیں، سب یہی بتلاتی ہیں، اور یہ چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے متواتر اور قطعی طور پر ثابت ہے۔**

علامہ ابن قیم اپنی کتاب ''ہدایۃ الحیاریٰ'' میں کہتے ہیں: من تامل سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبین لہ...أنہ إنما قاتل من قاتلہ وأما من ھادنہ فلم یقاتلہ۔ (۱)
جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں غور کرے گا اُس کو پتا چل جائے گا کہ آپ نے صرف اُن لوگوں سے جنگ کی جو آپ سے جنگ کرتے تھے، رہے وہ جنھوں نے آپ سے صلح کی آپ نے اُن سے جنگ نہیں کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دفاعی نہیں، اقدامی جنگیں بھی کیں

ان جنگوں کو جن بزرگوں نے ''محض دفاعی'' جنگوں کا نام دیا ہے، غالباً یہ لفظ اِس لیے صحیح نہیں کہ اس سے یہ خیال قائم ہوتا ہے کہ آپ نے دوسروں کے حملوں کا صرف دفاع کیا، حالاں کہ واقعہ یہ تھا کہ آپ محاربہ کا ارادہ اور تیاری کرنے والوں کے خلاف خود بھی اقدامات فرمایا کرتے تھے، جنگ بدر ایسے ہی ایک اقدام کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہوئی، موتہ اور تبوک کی یہی کہانی ہے، اور بنو مصطلق اور دیگر کئی مہموں کی یہی حقیقت ہے۔ آج کی اصطلاح میں آپ اُن جنگوں کو (Preemptive Wars) کہہ سکتے ہیں۔ یہ جنگیں اقدامی جنگیں ہی تھیں۔

بہرحال! آپ نے دفاعی جنگیں بھی لڑیں ہیں اور محاربہ کرنے والوں کے خلاف اقدامی جنگیں بھی۔ مگر آپ کی ہر جنگ صرف محارب طاقتوں کے خلاف تھی، اور اِسی لیے قطعی طور پر منصفانہ تھی اور اُس ''اعتداء'' اور زِیادتی سے پاک تھی جس سے دور رَہنے کا حکم قرآن نے مسلمانوں کو عین اُس وقت دیا تھا جب اُن پر جنگ کرنا واجب قرار دیا جارہا تھا۔ وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۰﴾ (بقرہ)

قرونِ اولیٰ کی جنگی مہمات

صحابہ کرام اور خلافت راشدہ کے دور میں فارس و روم کی مقبوضات فتح کی گئیں، اس دور میں ہم کو اُن دونوں سلطنتوں کے خلاف ایران کی سرحدوں سے لے کر شام و مصر کی آخری حدوں تک جنگوں کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے۔ جلد بازی اور

---

(۱) ہدایۃ الحیاریٰ، ج، اول، ص: ۱۱۲

سرسری نظر سے مطالعہ کرنے والے ان جنگوں کی علت یہ بتاتے ہیں کہ صحابہ کرام نے جب عرب کے دائیں بائیں نظر اُٹھائی کفار کو حکمراں دیکھا، تو اُن کو اپنے دین کا یہی حکم نظر آیا کہ اُن کے سروں پر تلوار لے کر پہنچ جائیں اور صاف کہہ دیں یا اسلام قبول کرو یا مسلمانوں کے لیے تخت چھوڑ دو۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگیں دراصل عہد نبوی کی جنگوں کا اِمتداد ہیں، رسول اللہ کی جب وفات ہوئی تو شام کے حدود پر رومن امپائر کے ساتھ جنگ شروع ہو چکی تھی اور متعدد معرکے ہو چکے تھے۔ قیصر اور اُس کی ماتحت طاقتیں اپنے پڑوس میں ایک انقلابی اور نہایت جاذب و مؤثر دعوت پر قائم ریاست کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے لاکھوں کے لشکر جمع کر چکی تھیں اور رَسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُن کی پیش بندی کے لیے اقدامات بھی فرمائے تھے۔ لیکن نہ رومیوں کا زور ٹوٹا تھا نہ اُن کے ارادے بدلے تھے۔ لہٰذا بعد میں بھی اِس قسم کے اقدامات کرنے ضروری تھے جو خلافت راشدہ کے دور میں انجام پائے۔

سلطنت فارس دوسری بڑی طاقت تھی، جو صحابہ کرام کے ہاتھوں زیر ہوئی، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کے فرماں روا کسریٰ کو دعوت اسلام کا خط لکھا، جو اُس نے نہ صرف نہایت رعونت کے ساتھ پھاڑ ڈالا، بلکہ اپنے ایک گورنر کو (معاذ اللہ!) رسول اللہ کو گرفتار کر کے اپنے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا، یمن کے گورنر نے دو سپاہیوں کو اس پیغام کے ساتھ مدینہ بھیجا کہ اپنی اور عرب کی خیر چاہتے ہو تو گرفتاری قبول کر کے کسریٰ کے دربار میں حاضر ہو جاؤ ورنہ تم کسریٰ کی طاقت و جبروت کو جانتے ہو وہ تمہارے پورے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔

بہر حال! اس پس منظر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ تصور سراسر سطحی مطالعہ پر مبنی ہے کہ خلافت راشدہ کے دور میں جو جنگیں ان ممالک کے ساتھ ہوئیں قصہ کی ابتدا وہیں سے ہوتی ہے، نہ اُن کے ساتھ کوئی کشمکش جاری تھی اور نہ یہ حکومتیں اس کے علاوہ کسی اور جرم کی مرتکب تھیں کہ وہ غیر مسلم تھیں اور صاحب شوکت تھیں۔

افسوس کس قدر سادگی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ لوگ جو خلافت راشدہ کی اُن جنگوں

کے پورے تاریخی پس منظر کے ریکارڈ ہونے کے باوجود اُن ظالم حکومتوں اور اُن کے دشمن حق حکمرانوں کے خلاف جنگ کا سبب صرف غیر مسلم حکومت کا خاتمہ قرار دے دیتے ہیں۔ کوئی شخص جو ایک طرف ان سلطنتوں کی توسیع پسندی کی ہوس اور خونی تاریخ کو جانتا ہو اور دوسری طرف وہ نو خیز اسلامی ریاست اور اُن طاقتوں کے ابتدائی تعلقات کے اس پس منظر پر بھی نظر رکھتا ہو جس کو ہم نے اُوپر ذکر کیا، کیا وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے بالکل پڑوس میں واقع ان عالم گیر طاقتوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا؟ اگر شدید خطرہ تھا تو اُن جنگوں کا سبب اس سنگین خطرے کی پیش بندی اور اِسلامی ریاست کا تحفظ تھا۔

ان دونوں حکومتوں سے جنگ کو مسلمانوں پر فرض کرنے والی ایک دوسری اہم چیز یہ بھی تھی کہ ان طاقتور حکومتوں کے باقی رہتے ان کے عوام تک اسلام کی دعوت پہنچنے کا قطعاً کوئی امکان نہیں تھا۔ اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اسلام کے اولین داعیوں کا کیا انجام رومن امپائر کی تابع ایک عرب ریاست میں ذات اطلاح کے مقام پر ہوا۔ دعوت اسلام دیتے ہی پندرہ میں سے چودہ داعیوں کو قتل کر دیا گیا۔ صرف ایک نہایت زخمی حالت میں مدینہ پہنچ سکا۔ ان ریاستوں کے ایک معزز اَمیر نے اسلام قبول کر لیا تو ہرقل (بیزنطینی رومن سلطنت کے فرماں روا) نے اس کو بلا کر قتل کر کے سولی پر لٹکا دیا کہ دوسروں کے لیے عبرت کا سامان بنے۔

نامۂ نبوی پر کسریٰ کے رعونت بھرے ردّعمل نے صاف بتا دیا تھا کہ فارسی علاقوں میں دعوت اسلام کا نام بھی نہیں لیا جا سکتا، ان حکمرانوں کی حکومتوں کے مذہبی جبر، اور قرآنی اصطلاح میں ''فتنہ'' اور صد عن سبیل اللہ'' نے یقیناً ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی کہ اللہ کے سپاہی اُٹھیں اور اُن کے غرور کو بحکم خدا خاک میں ملا دیں۔

ان حکومتوں کا یہی جرم دراصل صحابہ کرام کی جنگوں کا اصل سبب تھا، دراصل اس زمانہ کی صورت حال ہی ایسی تھی کہ کوئی حکومت اپنی قلم رو میں دوسرے دین کو اور خصوصاً اسلام جیسی دعوت کو ہرگز پنپنے نہیں دے سکتی تھی، یہ چیز اُس زمانے کی صورت حال میں بالکل قطعی اور طے تھی، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن حکمرانوں کو جو

خطوط لکھے تھے اُن میں کہا تھا کہ اگر تم اسلام نہیں لائے تو پوری قوم کے کفر کے تم ہی ذمہ دار ہو گے۔ آپ نے کسریٰ کو لکھا: فان أبیت فعلیک إثم المجوس۔ (تاریخ طبری: ۲ / ۱۲۳) مقوقس شاہ مصر کو آپ نے لکھا: فان أبیت فإن إثم القبط علیک۔ (زادالمعاد، ۳ / ۲۰۰) قیصر کو آپ نے لکھا: فعلیک إثم الأریسین۔ (صحیح بخاری، رقم: ۷) یریسین یا اریسین، سے مراد کاشتکاروں پر مشتمل وہ کثیر تعداد کی رعایا تھی جو رُومی مقبوضات (شام ومصر اور افریقہ وایشیا) کے وسیع علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی (فتح الباری) اور جن کی حیثیت تاریخ کی واضح شہادتوں کی روشنی میں مقہور ومجبور غلاموں کی سی تھی۔"(۱)

الغرض! عہد رسالت وعہد صحابہ میں مسلمانوں نے غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کے لیے یا ان سے اقتدار چھیننے کے لیے جنگیں نہیں کیں، بلکہ مسلمانوں کے گرد گھیرا تنگ کر کے حالات ایسے بنانے کی کوشش کی گئی کہ وہ اپنے دفاع کے لیے مجبور ہوں۔ اور ظاہر سی بات ہے کہ حق دفاع (self defence) انسان کا ایسا بنیادی حق ہے، جسے دنیا کے تقریباً تمام آئین یقینی بناتے ہیں۔ اس لیے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا، ہاں! اسلام کی حفاظت میں تلواروں کا یقیناً بڑا کردار ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جس منظم انداز میں چوطرفہ یلغار کی گئی، اگر اس کے جواب میں مسلمانوں نے دفاعی اقدام نہیں کیا ہوتا تو ان کا صفایا کب کا ہو چکا ہوتا۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مذکورہ آیات واحادیث وتفاسیر میں یا عہد رسالت وعہد صحابہ کی جنگوں میں جنوبی مشرقی ایشیائی ممالک کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ غالباً اس لیے کہ یہاں کے باشندے مجموعی طور پر امن پسند تھے جن کے عربوں کے ساتھ صدیوں سے دوستانہ تعلقات تھے۔ طلوع اسلام کے وقت یہ ممالک اسلام اور مسلمان کے لیے ہرگز خطرہ نہیں تھے۔ اس سلسلے میں بعض حضرات غزوۂ ہند والی خبر پیش کرتے ہیں، جو روایت ودرایت ہر دو جہت سے ناقابل التفات واعتبار ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن کی کتاب "کیا ہے غزوۂ ہند کی حقیقت؟"

---

(۱) ماہ نامہ الشریعہ، گوجرانوالہ، مارچ ۲۰۱۲ء، خصوصی اشاعت بعنوان "جہاد۔ کلاسیکی وعصری تناظر میں، ص: ۳۸-۴۱

جہاں تک خلافت راشدہ کے بعد کی جنگوں کا معاملہ ہے تو ان میں بعض اوقات شہادت حق کے بجائے مال غنیمت اور کشور کشائی کے جذبات بھی محرک رہے ہیں۔ چوں کہ اس وقت وہ ہماری بحث کا حصہ نہیں ہیں، اس لیے ان کا تفصیلی تجزیہ ابھی ممکن نہیں، تاہم اجمالی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کو اسلام اور قرآن کی میزان میں تولنے کے بجائے اگر ان کا منصفانہ تقابل تاریخ کی عام غیر مسلم حکومتوں کی جنگوں سے کیا جائے تو مسلم سلاطین کا کردار بوجوہ اعلیٰ اور خوش نما نظر آئے گا۔ استثناءات کی بات الگ ہے۔

گیارہواں سوال

کیا مصالحت صرف بصورت مجبوری ہی جائز ہے؟

اسلامی فلسفۂ جنگ پر ایک بڑا سوال یہ ہے کہ جب عام طور سے فقہا مصالحت کو جائز ہی نہیں سمجھتے، بلکہ عام حالات میں جنگ کو ضروری سمجھتے ہیں اور جب تک سخت مجبوری نہ ہو، مصالحت کا حکم نہیں دیتے، پھر ایسے میں یہ کیوں کر کہا جاسکتا ہے کہ اسلام صرف ظلم و جبر کے خلاف ہی جنگ کی اجازت دیتا ہے اور عام حالات میں امن و امان کی بات کرتا ہے؟

اس سلسلے میں عرض ہے کہ فقہی جزئیات کی تحقیق و تفتیش سے پہلے ہمیں آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ اور سیرت طیبہ کا رُخ کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ ہمیں وہاں سے کیا رہ نمائی ملتی ہے۔ اسلام میں صلح و معاہدہ اصولی اعتبار سے ایک مستحسن عمل ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے: وَالصُّلۡحُ خَيۡرٌ ۱۲۸ (سورہ نساء) صلح اچھی چیز ہے۔

اسلام صرف صلح کی مدح نہیں کرتا، بلکہ نقض صلح کی مذمت بھی کرتا ہے۔ صحیحین میں وارد ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاق کی تین علامات کے ضمن میں وعدہ خلافی کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ بات کتنی اہم ہے کہ اہل مکہ کی سازشوں اور وعدہ خلافیوں کے بعد جب اُن کے معاہدات توڑنے کا اعلان ہوا، اس وقت بھی قرآن نے ان قبائل کو اس سے مستثنیٰ رکھا، جنھوں نے عہد شکنی نہیں کی تھی۔ ارشاد ہے:

اِلَّا الَّذِيۡنَ عَاهَدْتُّمۡ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ثُمَّ لَمۡ يَنۡقُصُوۡكُمۡ شَيۡـًٔـا وَّلَمۡ يُظَاهِرُوۡا عَلَيۡكُمۡ اَحَدًا فَاَتِمُّوۡۤا اِلَيۡهِمۡ عَهۡدَهُمۡ اِلٰى مُدَّتِهِمۡ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَّقِيۡنَ ۴ (توبہ)

''مگر اُن مشرکین کے معاہدات ابھی باقی رہیں گے جنھوں نے تم سے معاہدے کے بعد اس میں کوئی کمی نہیں کی، نہ تمہارے خلاف بغاوت کی۔ اس لیے متعینہ مدت تک ان کے معاہدات کی پاس داری کرو، بے شک اللہ محتاط لوگوں کو پسند فرماتا ہے۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف صلح و معاہدہ فرمایا، بلکہ آخری حد تک اُسے نبھانے کی کوشش بھی کی۔

اسی طرح جب بھی صلح کی پیش کش ہوا ُسے ہر حال میں بے خوف و خطر اور بے چون و چرا قبول کرنے کا حکم ہے۔ ارشاد ہے:

وَ اِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا وَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۶۱﴾ (انفال)

''اگر سرکش منکرین صلح کی پیش کش کریں تو تم اُسے قبول کرو اور اس سلسلے میں اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔''

دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن نے مصالحت کی ترجیح کا یہ فارمولہ اس وقت پیش کیا ہے، جب کہ منکرین کی سرکشی، سازش، بغاوت، وعدہ خلافی اور اُس کے ردعمل میں ان کے ساتھ دوبدو جنگ کرنے کی بات چل رہی ہے۔ چناں چہ اس سے پہلی والی آیت میں ہے:

وَ اَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ وَّمِنۡ رِّبَاطِ الۡخَيۡلِ تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمۡ وَ اٰخَرِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِمۡ ۚ لَا تَعۡلَمُوۡنَهُمۡ ۚ اَللّٰهُ يَعۡلَمُهُمۡ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَىۡءٍ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۶۰﴾ (انفال)

''اُن سرکش منکرین کے خلاف جہاں تک ہو سکے قوت و طاقت اور جنگی گھوڑے تیار رکھو، تاکہ اُن کے ذریعے تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے دشمنوں کو دہشت زدہ کرسکو، جن کو صرف اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ تم اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی خرچ کروگے، وہ تمھیں پورا لوٹایا جائے گا اور اس سلسلے میں تمہارے ساتھ کچھ بھی زیادتی نہیں ہوگی۔''

اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسے خطرناک دشمنوں کی طرف سے پیش کی جانے والی مصالحت کو قبول کرنے کے حکم کے بعد اہل ایمان کے دلوں میں ایک شبہہ

پیدا ہوسکتا تھا کہ شاید دشمن کی یہ پیش کش دھوکہ اور فریب کے لیے ہو؟ اس شبہے کے ازالے کے لیے پہلے تو یہ فرمایا کہ فکر نہ کرو، اللہ پر بھروسہ کرو، وہ ہر مکر کو مکر کرنے والوں پر لوٹانے والا ہے۔ کسی کا مکر وفریب اس کے دائرۂ علم سے باہر نہیں ہے۔ پھر مزید یہ تسلی دی کہ جس رب نے ماضی میں نصرت وحمایت فرمائی وہ آئندہ بھی اپنی مدد سے محروم نہیں چھوڑے گا۔ ارشاد ہوا:

وَاِنۡ يُّرِيۡدُوۡۤا اَنۡ يَّخۡدَعُوۡكَ فَاِنَّ حَسۡبَكَ اللّٰهُ‌ ؕ هُوَ الَّذِىۡۤ اَيَّدَكَ بِنَصۡرِهٖ وَبِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝۶۲ (انفال)

''اگر یہ سرکش منکرین آپ کو دھوکہ دینا چاہتے ہوں تو اللہ آپ کے لیے کافی ہے۔ اسی نے اس سے پہلے بھی آپ کی اور اہل ایمان کی نصرت وحمایت فرمائی۔''

صلح حدیبیہ، جس میں کئی ایک دفعات بظاہر مسلمانوں کے مفاد کے خلاف تھیں، اس سے بھی اسلام میں امن ومصالحت کی ترجیح ثابت ہوتی ہے۔

چوں کہ یہ مصالحت صرف دس سالوں کے لیے ہوئی تھی، اس لیے اس سے بعض فقہا نے یہ استنباط کیا کہ مصالحت دس سال سے زیادہ کے لیے نہیں ہوسکتی، جب کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل سے دس سالہ مدت صلح کا جواز ثابت ہوتا ہے، اس سے زیادہ مدت کے لیے صلح نہیں ہوسکتی، یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہوتی۔ غالباً ایسے حضرات نے جنگ کو اسلام کی ترجیح سمجھ لیا، اس لیے صلح جو اُن کی نظر میں خلاف ترجیح عمل تھا، اس لیے اس کی تحدید، صلح حدیبیہ کی مدت سے کردی۔ افسوس کہ اس پورے استدلال کی بنیاد ہی خلاف اصل ہے۔ ہمارے خیال کی توثیق علامہ ابن نجیم مصری کے اس ارشاد سے ہوتی ہے:

أَرَادَ بِالصُّلۡحِ الۡعَهۡدَ عَلَى تَرۡكِ الۡجِهَادِ مُدَّةً مُعَيَّنَةً أَيَّ مُدَّةٍ كَانَتۡ وَلَا يَقۡتَصِرُ الۡحُكۡمُ عَلَى الۡمُدَّةِ الۡمَذۡكُورَةِ فِي الۡمَرۡوِيِّ لِتَعَدِّي الۡمَعۡنَى إِلَى مَا زَادَ عَلَيۡهَا۔ (البحرائق شرح کنز الدقائق: ۸۵/۵)

صلح سے مراد ایک معینہ مدت کے لیے ترک جہاد کا معاہدہ ہے، خواہ وہ مدت کوئی سی بھی ہو۔ لہٰذا صلح کی مدت صلح حدیبیہ کی مذکورہ مدت کے ساتھ محدود نہیں ہے، کیوں کہ صلح کا اطلاق معنوی طور سے اس سے زائد مدت پر بھی ہوتا ہے۔

ہاں! اصلاً صلح کی ترجیح کے باوجود، یہ ضرور ہے کہ مصالحت کرنے کے وقت حاکم کو دیکھنا چاہیے کہ مجموعی لحاظ سے ریاست کا نقصان تو نہیں ہو رہا۔ جہاں نقصان ہو، یا فائدے کے ساتھ نقصان کا پلہ بھاری ہو، وہاں مصالحت نہیں کی جا سکتی (۱) اور یہ ایک آفاقی عقلی اصول کے تحت ہے، جس کا احترام اسلام بھی کرتا ہے اور وہ ہے: اَهْوَنُ الْبَلِيَّتَيْنِ کا اصول۔ یعنی دو مصیبتوں میں سے نسبتاً ہلکی مصیبت کا انتخاب۔ یہی عقل مندی کا تقاضا ہے۔ اس لیے مصالحت اصلاً راجح ضرور ہے، لیکن اس ترجیح کے چکر میں ملک وملت کو مصیبتوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔

رہے وہ علما جنھوں نے ظاہر کتاب وسنت کے خلاف یہ کہا کہ مصالحت صرف مجبوری میں کی جائے گی، اُن کی بنیاد یہ ہے کہ مصالحت کے حوالے سے سابقہ نصوص منسوخ ہیں۔ آیت سیف نے اس قسم کے تمام نرم احکام کو منسوخ کر دیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کا یہ دعویٰ قابل غور ہے۔ علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس، مجاہد، زید بن اسلم، عطا خراسانی، عکرمہ، حسن اور قتادہ نے دعویٰ کیا ہے کہ آیت کریمہ -وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ -سورۂ براءت کی آیت سیف سے منسوخ ہے۔ جب کہ ان حضرات کا یہ دعویٰ محل نظر ہے۔ نہ یہ آیت منسوخ ہے، نہ مخصوص ہے اور نہ ہی اس میں اور آیت سیف میں کوئی ٹکراؤ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، الانفال: ٦١) علامہ ابن جریر طبری نے نسخ کے اقوال نقل کرنے کے بعد یہ فیصلہ سنایا ہے کہ قتادہ اور دیگر حضرات کا دعوئ نسخ بلا دلیل ہے، کتاب وسنت اور بداہت عقل اس کے خلاف ہیں۔ (تفسیر ابن جریر، الانفال: ٦١) امام رازی نے بھی اس مقام پر نسخ کا قول ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔

تقریباً تمام فقہا نے صلح کے لیے مصلحت کو ضروری قرار دیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ قیام امن وامان خود اپنی ذات میں ایک زبردست مصلحت ہے جس کے ساتھ انسانی جان و مال کی حفاظت، فروغ معاشرت وتجارت اور اشاعت دین وملت جیسے اعلیٰ مقاصد وابستہ ہیں۔

---

(۱) ایک فقہی ومنطقی اصول ہے۔ درء المفاسد أولیٰ من جلب المصالح (فائدہ اٹھانے کے بالمقابل نقصان سے بچنا زیادہ اولیٰ ہے۔)

ایک سوال یہ بھی اہم ہے کہ مصالحت صرف غیر مسلموں کے مطالبے پر کی جائے گی، جس کا ذکر آیت مذکورہ (انفال:٦١) میں ہے یا اس کے لیے مسلم ریاست کی طرف سے بھی پیش قدمی کی جاسکتی ہے؟ اس سلسلے میں علامہ ابن قیم لکھتے ہیں:

جَوَازُ ابْتِدَاءِ الْإِمَامِ بِطَلَبِ صُلْحِ الْعَدُوِّ، إِذَا رَأَى الْمَصْلَحَةَ لِلْمُسْلِمِينَ فِيهِ، وَلَا يَتَوَقَّفُ ذَلِكَ عَلَى أَنْ يَكُونَ ابْتِدَاءُ الطَّلَبِ مِنْهُمْ. (١)

اگر حاکم اسلام مسلمانوں کے حق میں مصالحت کو قرین مصلحت سمجھے تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ مصالحت کے لیے خود بھی پیش قدمی کرے۔

اسی طرح میثاق مدینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خطے میں محض قیام امن وسلام کے لیے بھی مصالحت کرنا جائز ہے، یہ خود اپنی ذات میں ایک بڑی مصلحت ہے، صرف اسلام اور مسلمانوں کے حق میں نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی فلاح، ہدایت اور کامرانی کے حق میں۔ اسی لیے بسا اوقات جنگوں کے دوران وقتی یا دائمی *cease-fire* کی بات کی جاتی ہے، تاکہ انسانی قدروں کو پامال ہونے سے بچایا جائے اور خون کے پیاسے انسانوں کو انسانیت پر سوچنے کا موقع فراہم کیا جائے۔

مصالحت کے باب میں ایک سوال اور بھی بہت اہم ہے اور وہ یہ کہ مصالحت کے بعد نقض عہد کرنا کیسا ہے؟ چوں کہ کثیر نصوص میں نقض عہد کو ایک بہت بڑا جرم کہا گیا ہے اور اسے منافق کی تین بڑی نشانیوں میں سے ایک بتایا گیا ہے، لیکن دوسری طرف مسلمانوں کے مصالح کی حفاظت اور انہیں مختلف طرح کے نقصانات سے بچانا بھی حاکم اسلام کا فرض ہے، اس لیے بعض فقہا نے لکھا ہے کہ اگر حاکم اسلام مسلمانوں کی مصلحت کے لیے نقض عہد کو ضروری سمجھے تو وہ ایسا کرسکتا ہے۔

اس کے برعکس بعض دوسرے فقہا نے کہا کہ وہ ایسا نہیں کرسکتا، کیوں کہ اسے اپنے وعدوں کا پابند ہونا چاہیے۔ صرف ایک صورت میں وہ ایسا کرسکتا ہے، جب کہ معاہدے میں اس بات کا ذکر ہو کہ طرفین یا ان میں سے کوئی ایک جب چاہیں معاہدہ توڑ سکتے ہیں۔

---

(١) زاد المعاد، فِي بَعْضِ مَا فِي قِصَّةِ الْحُدَيْبِيَةِ مِنَ الْفَوَائِدِ الْفِقْهِيَّةِ

اس مقام پر علامہ ابن قدامہ حنبلی نے ایک دلچسپ بات کہی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ مصالحت قیام امن کے لیے ہوتی ہے، لہٰذا اس میں نقض معاہدہ کے جواز کی شرط لگانا مصالحت اور معاہدے کی روح کے خلاف ہے۔اس لیے معاہدات میں ایسی شرط لگانا ہی سرے سے جائز نہیں ہے۔

جن فقہا نے اس شرط کی اجازت دی ہے، اُنھوں نے واقعۂ خیبر سے استدلال کیا ہے، جن کے معاہدے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا تھا کہ انہیں اس عہد پر باقی رکھا جائے گا، جب تک اللہ باقی رکھنا چاہے۔

اس استدلال کو رد کرتے ہوئے علامہ ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ اہل خیبر سے سرے سے معاہدہ ہوا ہی نہیں تھا۔خیبر تو بذریعۂ جہاد فتح کیا گیا تھا۔اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنھیں امان نامہ دیا تھا جس میں یہ بات لکھی تھی اور امان نامہ، معاہدہ یا میثاق نہیں ہوتا۔معاہدہ تو طرفین سے ہوتا ہے۔(۱)

بہر کیف! سورۂ انفال کی یہ آیت (۶۱) واضح کرتی ہے کہ اسلام کی ترجیح جنگ نہیں، بلکہ صلح ہے۔ جنگ ضرورت کی چیز ہے، شوق کی چیز نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جب یہ ضرورت آن پڑتی ہے تو اسلام، اہل ایمان کو بے خوف وخطر، شوق شہادت سے لبریز میدان میں اترنے کی ترغیب دیتا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ صلح وامن، اسلام کی مجبوری نہیں، بلکہ اسلام کی اولین ترجیحات میں سے ایک ہے، اس کے برعکس بعض ناگفتہ بہ حالات میں حرب وضرب نہ صرف اسلام کی مجبوری ہے، بلکہ آج بھی سرجیکل اسٹرائک کی شکل میں یہ بات دیکھنے کو ملتی ہے کہ ایک ملک دوسرے ملک پر اس وقت اچانک حملہ کرنے نکل جاتا ہے جب اسے دوسری طرف سے خطرات کے بھیانک بادل منڈلاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔افسوس کہ بعض اہل علم نے جوش تفسیر جہاد میں پورا نقشہ ہی پلٹ کر رکھ دیا ہے، جس کے سبب اسلام کا فلسفۂ جہاد کوئی وحشی نظریۂ جنگ معلوم ہوتا ہے۔والیہ المشتکیٰ!

❁❁❁

(۱) المغنی، الْجِهَادِ، مَسْأَلَةٌ أَهْلَ الذِّمَّةِ إِذَا نَقَضُوا الْعَهْدَ، فَصْلٌ مُهَادَنَةُ أَهْلِ الذِّمَّةِ عَلَى غَيْرِ مَالٍ

اصل الاصول

آخر میں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ بات درست ہے کہ قیام امن، ازالۂ فتنہ اور آزادی مذہب اسلام میں جنگ کے جواز کی بنیاد ہے، لیکن صرف اتنی سی بات سے ہی وہ جنگ جہاد نہیں بن سکتی جس کی حیثیت عبادت کی ہے اور جس پر آخرت میں اجر عظیم کی بشارتیں ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اعلاے کلمۃ الحق کی بلندی کی نیت ہو، آسان لفظوں میں جس سے حق تعالیٰ کی اطاعت و بندگی اور اس کی رضا کا حصول مطلوب ہو۔ اس نیت صالح کے بغیر دنیوی قانون کی روشنی میں اس جنگ کے جواز کا پروانہ تو دیا جا سکتا ہے، مگر اسے کوئی دینی عمل نہیں کہا جا سکتا، نہ اسے عبادت کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی عمل کے عبادت ہونے کے لیے اس میں رضائے الٰہی کی نیت کا ہونا اصل الاصول ہے۔ اس کی مزید وضاحت اس حدیث سے ہوتی ہے، جس سے امام بخاری نے صحیح بخاری کا آغاز کیا ہے۔ اس کے راوی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ.

اس بات کو مزید واضح کرنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بعد فرماتے ہیں:

وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا، أَوْ إِلَى امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا، فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ.

اور ہر شخص کو اس کی نیت کا ہی اجر ملنا ہے۔ لہٰذا جس کی ہجرت دنیا کے حصول کے لیے ہو یا کسی عورت سے نکاح کے لیے ہو تو اس کی ہجرت اس کی نیت کے مطابق ہی شمار کی جائے گی۔ (یعنی اس پر کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔)

دینی اعمال میں نیت کی بنیادی حیثیت کے حوالے سے شریعت کا یہ ایک عمومی حکم ہے، جس کے تحت جہاد کی دینی حیثیت اور تعبدی جہت بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ خاص عمل جہاد کے حوالے سے نیت رضاے مولیٰ کی تاکید بھی نصوص میں کثرت سے وارد ہے۔ ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ ﴿۱۹۰﴾ (بقرہ)

جوتم سے جنگ کریں، ان سے ''اللہ کی راہ'' میں جنگ کرو۔

گویا جنگ کا عمل جو ظلم وفتنہ کے خاتمہ کے لیے بظاہر خالص ایک دنیاوی عمل ہے، اسلام نے اسے بھی فِي سَبِيلِ الله کہہ کر للّٰہیت اور رضائے مولیٰ سے مشروط کر دیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں:

لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ، وَلَكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ. (متفق علیہ)

فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے، لیکن جہاد اور نیت صادقہ ضرور ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت میں فرماتے ہیں:

مَثَلُ الْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ - وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَنْ يُجَاهِدُ فِي سَبِيلِهِ - كَمَثَلِ الصَّائِمِ الْقَائِمِ، وَتَوَكَّلَ اللَّهُ لِلْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِهِ، بِأَنْ يَتَوَفَّاهُ أَنْ يُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ، أَوْ يَرْجِعَهُ سَالِمًا مَعَ أَجْرٍ أَوْ غَنِيمَةٍ. (۱)

اللہ کی رضا کے لیے لڑنے والے کی مثال اس شخص جیسی ہے جو دن میں روزہ دار اور رات میں عبادت گذار ہو اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی رضا کے لیے کون لڑتا ہے۔ اللہ نے اپنی رضا کے لیے لڑنے والے کے لیے عہد کر رکھا ہے کہ اگر میدان جنگ میں اس کی موت ہوئی تو اسے جنت میں داخل کرے گا، یا اسے اجر وثواب یا مال غنیمت کے ساتھ گھر واپس لائے گا۔

اس حدیث کریمہ میں جہاں اس بات کی وضاحت ہے کہ جہاد کی ساری فضیلتیں اور سارے اجر وثواب اس کو ملنے ہیں جو اللہ کی رضا کے لیے لڑ رہا ہو، وہیں اس بات کی بھی وضاحت ہے کہ عرفی مجاہد اور حقیقی مجاہد میں فرق ہے۔ یعنی عام لوگ تو ہر اس شخص کو مجاہد سمجھتے

---

(۱) صحیح البخاری، كِتَابُ الْجِهَادِ وَالسِّيَرِ، بَابُ أَفْضَلُ النَّاسِ مُؤْمِنٌ مُجَاهِدٌ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ

ہیں جو ظلم و نا انصافی کے خلاف لڑنے نکلا ہو، لیکن لڑنے والوں میں فی الواقع رضائے مولیٰ کی نیت کتنوں کی ہے اور کتنوں کی نیت محض نام و نمود اور دولت و شہرت کے حصول کی ہے، یہ صرف اللہ ہی جانتا ہے، بندوں کے سامنے یہ حقیقت آخرت میں ہی بے حجاب ہوگی۔

احادیث کریمہ سے انتہائی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ وہی ہے، جو رضاے الٰہی کے ساتھ کیا جائے۔ ایک بار آپ ﷺ سے کسی نے دریافت کیا کہ کوئی اظہار شجاعت کے لیے لڑتا ہے، کوئی قومی غیرت کے لیے تو کوئی ریا و شہرت کے لیے۔ کیا ان میں سے بھی کسی کا عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا:

جہاد فی سبیل اللہ تو محض اس کا عمل ہے، جو دین حق کی سربلندی کے لیے لڑتا ہے۔

مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللهِ هِيَ الْعُلْيَا، فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللهِ. (۱)

رہی یہ بات کہ جو رضائے الٰہی کی نیت سے جہاد نہیں کرتا، بلکہ محض نام و نمود اور مال و منال کے لیے جنگ کرتا ہے، آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے، تو یہ بات متعدد احادیث میں بہت ہی وضاحت کے ساتھ کہی گئی ہے۔ ایک صحیح روایت میں ہے کہ ایک شخص بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر عرض گذار ہوا:

''حضور! اس شخص کے بارے میں کیا رائے ہے، جو مال اور شہرت کے لیے لڑتا ہے؟''

حضور نے جواباً فرمایا: ''اسے کچھ نہیں ملے گا۔''

سائل تین بار یہی سوال دہراتا رہا اور حضور اکرم ﷺ ہر بار یہی فرماتے رہے۔ اس کے بعد فرمایا:

''اللہ صرف اسی عمل کو قبول فرمائے گا، جو بطور خاص اس کے لیے انجام دیا گیا ہو اور جس کا مقصود محض اسی کی رضا کا حصول ہو۔

إِنَّ اللهَ لَا يَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا كَانَ لَهُ خَالِصًا، وَابْتُغِيَ بِهِ وَجْهُهُ. (۲)

گویا، اس حدیث پاک میں اس شبہے کا بھی ازالہ ہے کہ رضاے الٰہی کی نیت کے بغیر جو محض امن و امان کے قیام کے لیے جنگ کرے اس کو آخرت میں اجر کیوں نہیں ملے

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، حدیث: ۱۹۰۴

(۲) سنن النسائی، كِتَابُ الْجِهَادِ، مَنْ غَزَا يَلْتَمِسُ الْأَجْرَ وَالذِّكْرَ

گا؟ خلاصۂ جواب یہ ہے کہ مزدور جس کے لیے مزدوری کرتا ہے، مزدوری بھی اسی سے پاتا ہے۔ لہٰذا جب کہ اس نے اللہ سے اجر طلب کرنے کے لیے جہاد ہی نہیں کیا، تو پھر اللہ سے اجر نہ ملنے پر شکوہ کیسا؟ ہاں! جس نیت سے اس نے جنگ کی، نام ونمود اور دنیوی جاہ و شرف، وہ تو اسے حاصل ہو ہی گیا۔

صحیح مسلم میں تو مزید وضاحت کر دی گئی ہے کہ جس نے رضائے الٰہی کے بغیر محض اپنی شجاعت کے لیے جنگ کی ہوگی، اسے قیامت میں اجر دینے کے بجائے الٹے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

إِنَّ أَوَّلَ النَّاسِ يُقْضَى يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَيْهِ رَجُلٌ اسْتُشْهِدَ، فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا، قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا؟ قَالَ: قَاتَلْتُ فِيكَ حَتَّى اسْتُشْهِدْتُ، قَالَ: كَذَبْتَ، وَلَكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِأَنْ يُقَالَ: جَرِيءٌ، فَقَدْ قِيلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ حَتَّى أُلْقِيَ فِي النَّارِ. (۱)

قیامت کے دن سب سے پہلے ایک مرد شہید کا فیصلہ ہوگا۔ اسے لایا جائے گا، حق تعالیٰ اسے نعمتوں کی شناخت کرائے گا، جن کو وہ پہچان لے گا۔ پھر حق تعالیٰ دریافت کرے گا: اس کے لیے تو نے کیا کیا تھا؟ وہ عرض کرے گا: مولیٰ! میں نے تیری راہ میں جنگ کی، یہاں تک کہ میں شہید ہو گیا۔ حق تعالیٰ فرمائے گا: تو جھوٹ کہہ رہا ہے۔ ہاں! تو نے جنگ کی، مگر صرف اس لیے تاکہ تجھے بہادر کہا جائے اور وہ کہا جا چکا۔ پھر اس کے بارے میں حکم ہوگا اور اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

بہر کیف! دنیا میں جنگ کے جواز کے لیے تو اتنا ہی کافی ہے کہ قیام امن اور ازالۂ فتنہ کے لیے اس کی ضرورت ہو، مگر آخرت میں اس پر اجر پانے کے لیے اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے پیچھے رضائے مولیٰ کی طلب ہو اور رضائے مولیٰ کی بات آتے ہی ان تمام اخلاقی اصول وضوابط اور شرائط وآداب کی رعایت لازمی ہو جاتی ہے، جن کی پابندی کو اسلام نے اس باب میں مقرر کر رکھا ہے۔

❁❁❁

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، حدیث: ۱۹۰۵

شرائط وآداب

اسلام میں جنگ کے جواز کے لیے اعلیٰ مقاصد اور بنیادی اسباب کا پایا جانا ہی ضروری نہیں ہے، بلکہ اس کے بعد دیگر آداب وشرائط بھی ہیں جن کا پاس رکھنا حد درجہ ضروری ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں ان میں سے بعض اہم امور کا مختصراً تذکرہ کیا جارہا ہے:

جنگ بوجہ مجبوری

چوں کہ جنگ بذاتہ ایک مذموم شے ہے، اسی لیے اس کا جواز از راہ مجبوری ہے، نہ کہ از راہ شوق۔ اسی لیے حدیث پاک میں جنگ طلبی سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

لَا تَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ، وَسَلُوا اللّٰہَ الْعَافِیَةَ. (متفق علیہ)

دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا مت کرو، بلکہ حق تعالیٰ سے امن وعافیت کی دعا کرو۔

رہا یہ کہ پھر یہ کیوں کہا گیا:

وَاعْلَمُوا أَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوفِ.

(جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔)

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حق ہے کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔ لیکن ابھی یہ بات غور طلب ہے کہ تلواروں کے سائے میں جنت طلب کب کی جائے گی۔ کیا یہ ایک دائمی حکم ہے یا عارضی اور وقتی حکم ہے، جو مخصوص حالات سے مختص ہے؟ ان سارے سوالات اور پیچیدگیوں کی وجہ یہ ہے کہ یہ حدیث ناقص qoute کی گئی ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس حدیث کا سابقہ حدیث سے کوئی تعارض نہیں ہے، بلکہ یہ اسی کا ایک جز ہے۔ پوری

حدیث نقل کرنے سے سارے ابہامات اور سوالات دور ہوجاتے ہیں۔ یہ پوری حدیث یوں ہے:

أَيُّهَا النَّاسُ، لاَ تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ العَدُوِّ، وَسَلُوا اللَّهَ العَافِيَةَ، فَإِذَا لَقِيتُمُوهُمْ فَاصْبِرُوا، وَاعْلَمُوا أَنَّ الجَنَّةَ تَحْتَ ظِلاَلِ السُّيُوفِ (متفق علیہ)

اے لوگو! دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا مت کرو، بلکہ حق تعالیٰ سے امن وعافیت کی دعا کرو۔ ہاں! البتہ جب مڈبھیڑ ہوجائے تو اب ثابت قدم رہو اور یقین رکھو کہ جنت تلواروں کے سائے میں ہے۔

پوری حدیث qoute کرتے ہی سارے سوالات وشبہات از خود رفع ہوگئے۔ اب معلوم ہوا کہ تلواروں کے سائے میں جنت اس وقت طلب کی جائے، جب جنگ ناگزیر ہوجائے، اس وقت جنگ سے فرار یا بزدلی ارباب عزیمت طالبین جنت کا شیوہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت حال میں ملکی اور بین الاقوامی قانون بھی جنگ جی اجازت دیتا ہے۔ اسی تناظر میں اس حدیث پاک کو بھی سمجھنا چاہیے:

وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَوَدِدْتُ أَنِّي أُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللهِ، ثُمَّ أُحْيَا . (متفق علیہ)

(قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، میں چاہتا ہوں کہ میں اللہ کی راہ میں شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں۔)

اس حدیث سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ وشہادت کی تمنا کیا کرتے تھے، جب کہ گذشتہ حدیث میں مذکور ہے کہ آپ نے جنگ کی تمنا سے منع فرمایا ہے۔ ان دونوں حدیثوں میں بھی اسی طرح تطبیق دی جاسکتی ہے کہ اپنی طرف سے جنگ کی طلب اچھی بات نہیں ہے، لیکن جب جنگ ناگزیر ہوجائے تو ایسی صورت میں جنگ سے بھاگنے اور موت سے ڈرنے کے بجائے، اللہ کی رضا کی خاطر اپنی ملت، اپنی قوم اور اپنے وطن کے تحفظ کو عبادت سمجھتے ہوئے جان کی پروا کیے بغیر بے خطر میدان جنگ میں کود جایا جائے۔ ایسے موقع پر زندگی کی طلب انتہائی درجے کی موت اور بے غیرتی ہے، جب کہ پوری جرات مندی کے ساتھ موت کا سامنا دنیا میں نیک نامی اور آخرت میں سعادت ودرجات کا باعث ہے۔ بلاتفریق مذہب وملت ہندوستانیوں کی حفاظت اور انگریزوں کے

خلاف بغاوت کے لیے ۱۸۵۷ء میں سامنے آنے والے علامہ فضل حق خیر آبادی کے فتویٰ جہاد کو اسی تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اگر مذکورہ حدیث کو مکمل طور سے سامنے رکھیں تو اس مفہوم کی وضاحت اور تائید بھی ہوتی ہے۔ پوری حدیث یوں ہے:

وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْلاَ أَنَّ رِجَالًا مِنَ المُؤْمِنِينَ لاَ تَطِيبُ أَنْفُسُهُمْ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنِّي، وَلاَ أَجِدُ مَا أَحْمِلُهُمْ عَلَيْهِ مَا تَخَلَّفْتُ عَنْ سَرِيَّةٍ تَغْزُو فِي سَبِيلِ اللَّهِ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوَدِدْتُ أَنِّي أُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ، ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ، ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ.(۱)

قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے۔ میرے پاس اتنا ساز وسامان نہیں کہ اس کے ساتھ تمام اہل ایمان کو جہاد فی سبیل اللہ پر لے کر جاؤں اور چوں کہ بے ساز وسامان مسلمانوں کو یہ بات ناگوار گزرے گی اگر میں انہیں چھوڑ کر دوسرے مسلمانوں کے ساتھ جہاد کے لیے نکل جایا کروں۔ اگر یہ خدشہ نہ ہوتا تو میں اللہ کی راہ میں لڑنے والے ہر لشکر میں شامل ہوتا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، میں چاہتا ہوں کہ میں اللہ کی راہ میں شہید کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر شہید کیا جاؤں۔

الغرض! یہ آرزوئے شہادت جنگ کے مسلط ہونے کے بعد کے لیے ہے۔

قدرت واستطاعت

جنگ کے اعلیٰ مقاصد اور اسباب کے ہونے کے ساتھ جنگ کی استطاعت بھی ایک لازمی شرط ہے۔ جنگ کی استطاعت کے بغیر جنگ کے لیے نکل پڑنا، خودکشی کے مترادف ہے۔ اللہ کریم کا ارشاد ہے: لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (البقرۃ: ۲۸۶) اللہ طاقت سے زیادہ کسی جان کو مکلف نہیں کرتا۔

مشہور فقیہ علامہ علاء الدین کاسانی (۵۸۷ھ) اس باب میں لکھتے ہیں:

---

(۱) صحیح البخاری، كِتَابُ الجِهَادِ وَالسِّيَرِ، بَابُ تَمَنِّي الشَّهَادَةِ

إِنَّهُ لَا يُفْتَرَضُ إِلَّا عَلَى الْقَادِرِ عَلَيْهِ فَمَنْ لَا قُدْرَةَ لَهُ لَا جِهَادَ عَلَيْه. (۱)

جہاد صرف اسی پر فرض ہے، جو اس پر قادر ہے، جو اس کی قدرت نہیں رکھتا، اس پر فرض بھی نہیں ہے۔

ریاست اور امارت

واضح رہے کہ داعش جیسی تنظیموں کی جنگی کارروائیاں جہاد کے بجائے فساد اور بغاوت کے زمرے میں آتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس نہ ریاست ہے اور نہ ہی امیر ریاست اور اسلام میں جنگ کے لیے حاکم ریاست کی اجازت اور کسی امیر جنگ کی اطاعت ضروری ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں:

إِنَّمَا الإِمَامُ جُنَّةٌ يُقَاتَلُ مِنْ وَرَائِهِ وَيُتَّقَى بِهِ (۲)

امیر ڈھال ہوتا ہے، اسی کے سائے اور پناہ میں جنگ لڑی جاتی ہے۔

حضرت قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں:

وَلا تَسْرِي سَرِيَّةٌ إِلا بِإِذْنِ الإِمَامِ أَوْ مَنْ يُوَلِّيهِ عَلَى الْجَيْشِ. (۳)

کوئی لشکر سلطان یا اس کے نائب کی اجازت کے بغیر جنگ کے لیے نہیں نکلے گا۔

ہاں! ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی شہر، بستی، گروہ یا شخص پر کوئی دوسرا گروہ یا شخص اچانک حملہ آور ہو جائے تو ایسی صورت میں موجودین پر فرض ہے کہ۔ امیر کی امارت، اجازت یا موجودگی کے بغیر بھی۔ اپنی اور اپنے لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ یہ استثنائی اور اضطراری صورت ہے، self defence کے تحت جس کی پوری دنیا اجازت دیتی ہے۔ بھارتی نیائے سنہیتا ۲۰۲۳ء کے اندر right of private defence کے عنوان سے ۳۴ تا ۴۴ دفعات اسی موضوع سے بحث کرتی ہیں۔ دفعہ ۳۴ کے تحت واضح لفظوں میں لکھا ہوا ہے:

Nothing is an offence which is done

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب السیر، فَصْلٌ فِي بَيَانِ كَيْفِيَّةِ فَرْضِيَّةِ الْجِهَادِ

(۲) صحيح البخاری، كِتَابُ الجِهَادِ وَالسِّيَرِ، بَابُ يُقَاتَلُ مِنْ وَرَاءِ الإِمَامِ وَيُتَّقَى بِهِ

(۳) کتاب الخراج، ص: ۲۱۷، المکتبة الأزهرية للتراث، قاہرہ

in the exercise of the right of private defence.

اپنے دفاع کا حق استعمال کرتے ہوئے جو کچھ کیا جائے وہ جرم نہیں ہے۔

تقویٰ اور اطاعت

جہاد کے دوران تقویٰ، خوف خدا اور دینی و اخلاقی اصولوں کی پابندی بھی از حد ضروری ہے۔ کتب احادیث میں یہ مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ جب بھی کسی معرکے پر کوئی لشکر روانہ کرتے تو امیر لشکر اور اس کے ساتھیوں کو تقویٰ اور خیر کی نصیحت کرتے۔(۱)

علامہ کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

''نبی کریم ﷺ سے ایسا ہی منقول ہے کہ جب بھی آپ کوئی لشکر روانہ کرتے تو بطور خاص امیر لشکر اور اس کے ہمراہ مسلمانوں کو تقویٰ اور خیر کی نصیحت کرتے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ امارت اللہ کی امانت ہے، اس لیے اس بار کو صرف متقی شخص ہی اٹھا سکتا ہے۔ جب سلطان کسی کو امیر لشکر بنائے تو دوسروں کو امیر کے احکام کی اطاعت کا پابند کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (النساء: ۵۹) اے ایمان والو! اللہ و رسول کی اطاعت کرو اور اپنے امیر کی اطاعت کرو۔ **اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: امیر کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو، جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق حکم دیتا رہے، خواہ تمہارے اوپر کسی نک کٹے حبشی غلام ہی کو کیوں نہ امیر مقرر کیا گیا ہو۔ [مطلب امیر جو بھی ہو اس کی اطاعت کی جائے گی اور اس کا حسب و نسب نہیں دیکھا جائے گا۔]**

امیر کی اطاعت اس لیے بھی ضروری ہے، کیوں کہ وہ سلطان کا نائب ہے اور چوں کہ سلطان کی اطاعت لازم ہے، اس لیے اس کے نائب کی اطاعت بھی لازم

---

(۱) عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَمَّرَ أَمِيرًا عَلَى جَيْشٍ، أَوْ سَرِيَّةٍ، أَوْصَاهُ فِي خَاصَّتِهِ بِتَقْوَى اللهِ، وَمَنْ مَعَهُ مِنَ الْمُسْلِمِينَ خَيْرًا. (صحیح مسلم، كِتَابُ الْجِهَادِ وَالسِّيَرِ، بَابُ تَأْمِيرِ الْإِمَامِ الْأُمَرَاءَ عَلَى الْبُعُوثِ، وَوَصِيَّتِهِ إِيَّاهُمْ بِآدَابِ الْغَزْوِ وَغَيْرِهَا)

ہوگی، کیوں کہ امیر کی اطاعت درحقیقت سلطان ہی کی اطاعت ہے، اِلا یہ کہ امیر معصیت کا حکم دے تو ایسی صورت میں اس امیر کی اطاعت جائز نہیں ہوگی، کیوں کہ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں: خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔ لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ. (۱)

البتہ اگر امیر کسی ایسی بات کا حکم دے جس کے بارے میں لوگوں پر واضح نہ ہو کہ اس میں ان کا فائدہ ہے یا نقصان، تو ایسی صورت میں بھی ان کو امیر کی اطاعت کرنی ہوگی، بشرطے کہ انہیں اس بات میں اللہ کی معصیت نہ ہونے کا علم ہو۔ وجہ یہ ہے کہ اجتہادی امور میں امیر واجب الاتباع ہوتا ہے، جیسا کہ ایسے امور میں قاضی کا فیصلہ آخری مانا جاتا ہے۔ وَاللّٰهُ تَعَالَى أَعْلَمُ.'' (۲)

واضح رہے کہ جنگ کی استطاعت کا مسئلہ عدد اور افراد کے بجائے قوت اور اسباب پر موقوف ہے۔ آج بھی ایسے سادہ لوح مسلمانوں کی کمی نہیں ہے، جن کی ساری توجہ امت کی قوت کے بجائے امت کی کثرت پر مرکوز ہے۔

دعوت قبل جہاد

اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں:

وَإِذَا لَقِيتَ عَدُوَّكَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ، فَادْعُهُمْ إِلَى ثَلَاثِ خِصَالٍ - أَوْ خِلَالٍ - فَأَيَّتُهُنَّ مَا أَجَابُوكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ، وَكُفَّ عَنْهُمْ، ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى الْإِسْلَامِ، فَإِنْ أَجَابُوكَ، فَاقْبَلْ مِنْهُمْ، وَكُفَّ عَنْهُمْ. (۳)

''جب مشرکین میں سے ان سے ملو جو تمہارے دشمن ہوں تو انہیں تین باتوں کی دعوت دو، وہ ان میں سے جس بات کو بھی منظور کرلیں تم اسے قبول کرلو اور ان سے جنگ نہ کرو۔ سب سے پہلے انہیں اسلام کی دعوت دو، اگر وہ قبول کرلیں تو ان کی اس قبولیت کو تم قبول کرلو اور ان سے جنگ نہ کرو۔''

---

(۱) شرح السنة للبغوی، كِتَابُ الإِمَارَةِ وَالْقَضَاءِ، بَابُ الطَّاعَةِ فِي الْمَعْرُوف، حدیث صحیح

(۲) بدائع الصنائع، کتاب السیر، فَصْلٌ فِي بَيَانِ مَا يَنْدُبُ إِلَيْهِ الْإِمَامُ عِنْدَ بَعْثِ الْجَيْشِ أَوْ السَّرِيَّةِ

(۳) صحیح مسلم، كِتَابُ الْجِهَادِ وَالسِّيَرِ، بَابُ تَأْمِيرِ الْإِمَامِ الْأُمَرَاءَ عَلَى الْبُعُوثِ، وَوَصِيَّتِهِ إِيَّاهُمْ

اس کے آگے والے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو ان سے باعزت شہری بننے کے لیے ٹیکس کا مطالبہ کرو اور اگر اس کے لیے بھی راضی نہ ہوں تو آخری آپشن کے طور پر جنگ کرو۔ یہ ایک بہترین اصول جنگ ہے جس کی تحسین ہونی چاہیے۔ یہ اصول جنگ صرف اسلام کے پاس ہے کہ بدترین دشمن۔جس سے جنگ ناگزیر ہو چکی ہو، یہاں تک کہ صف بندی کی جا چکی ہو۔اُسے بھی جنگ سے قبل، عدم جنگ کا آخری موقع دیا جائے اور کہا جائے کہ اگر تم اسلام قبول کر لیتے ہو تو تمہارے پچھلے سارے جرائم معاف کر دیے جائیں گے اور تم کو امان دے دیا جائے گا، لیکن اگر وہ یہ موقع بھی گنوا دے تو پھر جنگ مجبوری ہو گی۔

افسوس کہ بہتوں کو اس سے یہ خیال گزرتا ہے کہ گویا اسلام ہر اس قوم سے جنگ کرنا چاہتا ہے جو اسلام کی دعوت قبول نہ کرے، جب کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جن قوموں کی دغابازیوں اور شرانگیزیوں نے جنگ کو واجب کر دیا ہو، ان کے حق میں بھی اسلام سقوط جنگ کا ایک آخری موقع رکھتا ہے، اگر وہ آخر آخر میں ہی سہی، زبان سے کلمۂ اسلام کا اقرار کر لیں۔ یہاں اسلام اس شبہے کو خاطر میں نہیں لاتا کہ شاید انہوں نے جان بچانے کے لیے زبان سے کلمۂ توحید پڑھ لیا ہو، بلکہ محض کلمۂ اسلام کے احترام میں اسلام واجب جنگ کو بھی ساقط کر دیتا ہے۔ سیاق حدیث پر غور کرنے سے اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اسلام مجرموں کو قبولِ اسلام کے بعد معاف کیوں کر دیتا ہے؟ انہیں سزا کیوں نہیں دیتا؟ خاص طور پر ایسے مجرموں کو جن کے خلاف جنگ واجب ہو چکی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل اسلامی ریاست کے لیے قبولیت اسلام کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ سرکش گروہ نے ریاست کے سامنے surrender کر لیا ہے اور اسلام اپنے دشمنوں کو surrender ہونے کے بعد آخری موقع دینا ضروری سمجھتا ہے، تا کہ ہر ممکن طور سے خون بہنے کو روکا جا سکے۔

دعا قبل جہاد

ایک مسلمان کے لیے یہ فرض ہے کہ کسی بھی چیز کی مکمل تیاری اور کوشش کے بعد بھروسہ اللہ پر رکھے، اپنے ساز و سامان پر نہ رکھے۔ تقدیر و تدبیر کے دونوں پہیے اسی طرح

ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جس طرح تدبیر اور سعی و کوشش کے بغیر توکل علی اللہ کی بات ایک قسم کی کم ہمتی اور ضلالت ہے، اسی طرح توکل علی اللہ کے بغیر اسباب و ذرائع پر اعتماد کفر و زندقہ ہے۔ یہ اصول زندگی کے دیگر میدان عمل کے ساتھ میدان جنگ میں بھی یکساں واجب العمل ہے۔

اس کے ساتھ جہاد کے آداب سے یہ ہے کہ جنگ کی پوری تیاری کے بعد باضابطہ دعا بھی کی جائے۔ امام مسلم نے کتاب الجہاد میں باضابطہ عنوان باب ہی ایسا باندھا ہے جس سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ عنوان باب ہے: بَابُ اسْتِحْبَابِ الدُّعَاءِ بِالنَّصْرِ عِنْدَ لِقَاءِ الْعَدُوِّ دشمن سے مڈبھیڑ کے وقت دعا کے استحباب کا بیان۔

اس کے تحت جنگ خندق کے موقع پر کی جانے والی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ دعا نقل کی ہے:

اللهُمَّ، مُنْزِلَ الْكِتَابِ، سَرِيعَ الْحِسَابِ، اهْزِمِ الْأَحْزَابَ، اللهُمَّ، اهْزِمْهُمْ وَزَلْزِلْهُمْ. (متفق علیہ)

بار الٰہا! آسمانی کتاب نازل کرنے والے، جلد حساب لینے والے، ان گروہوں کو شکست سے دوچار کردے، ان کے پیر اکھاڑ دے اور ان کو متزلزل فرما دے۔

قابل ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعا مکمل تیاری کے بعد فرمائی۔ اسی قسم کا واقعہ جنگ بدر کے موقع پر بھی پیش آیا، جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکمل تیاری کرنے کے بعد یہ دعا کی: ''بارِ الٰہا! اگر مٹھی بھر یہ جماعت شکست کھا گئی پھر زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی۔''(۱)

اخلاقیات جنگ

جیسا کہ ابتدائی سطور میں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ اسلام میں جنگ کی وجہِ جواز محض دفع فتنہ اور قیام امن و امان ہے، اس لیے جب جنگ شروع ہو جائے تو ایسے موقع پر بھی آداب و اخلاق کی ممکنہ پاس داری ضروری ہے۔ کہتے ہیں کہ:

Everything is fair in love and war.

''محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔''

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، بَابُ الْإِمْدَادِ بِالْمَلَائِكَةِ فِي غَزْوَةِ بَدْرٍ، وَإِبَاحَةِ الْغَنَائِمِ

لیکن اس بے اصولی کو اسلام جائز نہیں سمجھتا۔ اسلام نے جنگ کے بھی آداب رکھے ہیں، جن کی خلاف ورزی ہرگز جائز نہیں ہے۔ اس حوالے سے چند اہم باتیں یہاں پیش کی جاتی ہیں:

صرف جنگ جو کا قتل

انسان عام طور پر جنگ میں ایک وحشی درندہ بن جاتا ہے اور دشمن کے نام ونشان کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ لیکن اسلام نے انسان کے اس وحشی جذبات کو کنٹرول کیا ہے۔ چوں کہ اصل جنگ وقتال ہی اسلام میں مجبوری کا مسئلہ ہے، اس لیے جنگ میں قتل بھی اسی کا روا ہے جس کو قتل کرنا دفع فساد کے لیے مجبوری ہو اور ایسا شخص محض فوجی اور جنگ جو ہے یا ایسا مرد قوی جو آپ کے خلاف جنگ وقتل کر سکتا ہو۔

اس لیے جو لوگ بھی اس زمرے میں نہیں آتے ان کو جنگ کے دوران بھی قتل نہیں کیا جا سکتا۔

ایسے ہی افراد جن کا قتل جنگ میں جائز نہیں ہے، ان میں سرفہرست عورت اور بچے ہیں۔ کسی جنگ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک عورت کی لاش دیکھی تو آپ کو اس سے تکلیف ہوئی۔ آپ نے عورت اور بچے کے قتل پر اپنی ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور اس سے منع فرما دیا۔(۱)

ہاں! یہ ضرور ہے کہ جن عورتوں اور بچوں کا قتل بالقصد نہ ہو، بلکہ غیر ارادی طور پر ہو، یا نشانہ مردوں پر ہو اور زد میں عورتیں اور بچے بھی آجائیں تو یہ ایک استثنائی صورت ہے۔ بصورت دیگر نا جائز اور حرام ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی طرح مذہبی پیشواؤں کے قتل سے بھی منع فرما دیا۔ آپ فرماتے ہیں: وَلَا تَقْتُلُوا الْوِلْدَانَ، وَلَا أَصْحَابَ الصَّوَامِعِ. بچوں اور مذہبی پیشواؤں کو بھی قتل مت کرنا۔ یہ حدیث امام احمد، امام طحاوی، امام بیہقی اور دیگر محدثین نے نقل کی ہے۔

---

(۱) أَنَّ امْرَأَةً وُجِدَتْ فِي بَعْضِ مَغَازِي رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَقْتُولَةً، فَأَنْكَرَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَتْلَ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ، وفی روایة فَنَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ (متفق علیہ)

اس سے بھی جنگ کے دوران اسلام کی امن پسندی اور ہم دردی ظاہر ہے۔ اسلام میں اگر مذہبی منافرت کی ذرہ برابر جگہ ہوتی تو سب سے پہلے دیگر مذاہب کے مذہبی پیشواؤں کو قتل کرنے کی بات کرتا، جو اسلام کی تبلیغ و توسیع میں سب سے بڑے نظری و فکری رکاوٹ ہوتے ہیں، مگر اسلام نے ایسا نہیں کیا، بلکہ جنگ کے مخصوص حالات میں بھی ان کے قتل کو ممنوع قرار دیا، جب کہ ظاہر ہے کہ وہ جنگ میں بھی حصہ لے سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اسلام نے ان کے قتل سے اس لیے منع کیا، کیوں کہ اس سے مذہبی منافرت کا پیغام جائے گا جو قیام امن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنے گا، جب کہ اسلام میں جنگ بغرض فتنہ و فساد نہیں، بلکہ بغرض امن و امان مشروع ہوئی ہے۔

بات صرف غیر محارب انسانوں کے قتل کی ممانعت کی نہیں ہے بلکہ دیگر ذی روح مخلوقات کا قتل بھی ممنوع ہے، اگر بغرض غیظ و غضب ہو، ہاں! یہ عمل شکار کر کے کھانے کے لیے ہو تو یہ ایک الگ بات ہے۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ رقم طراز ہیں:

''چوں کہ جاندار کے قتل سے اسے شدید تکلیف پہنچتی ہے، اس لیے اس کا قتل حرام ہے، اِلا یہ کہ کھانے کے لیے ذبح کیا جائے، البتہ محض دشمن کے جوش غضب میں ان کا قتل جائز نہیں ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

من قتل عصفورا فما فوقها بغير حقها سأله الله عنها قيل: وما حقها يا رسول الله قال: يذبحها فيأكلها ولا يقطع رأسها فيرمي به. [1]

جو گوریا یا اس سے بھی چھوٹی مخلوق کا ناحق قتل کرتا ہے، اللہ اس سے اس کا حساب لے گا۔ کسی نے دریافت کیا: حضور! ان کے قتل کی درست وجہ کیا ہے؟ حضور نے فرمایا: وہ یہ ہے کہ ان کو کھانے کے لیے ذبح کرے۔ ان کے سر کو نشانہ بازی کے لیے استعمال نہ کرے۔''

بہرکیف! جس طرح صرف اضطراری صورت حال (emergency situation) میں ہی جنگ مشروع ہے، اسی طرح جنگ کے دوران بھی صرف انہی

---

[1] الأم، مسائل في الجهاد والجزية، في قطع الشجر وحرق المنازل

لوگوں کا قتل جائز ہے، جو جنگ کرنے آئے ہیں اور اگر وہ جنگ کرنے سے رک جائیں، یا سرینڈر کر دیں تو پھر جنگ قتل وغارت گری کے بغیر ختم کر دی جائے گی اور خون ناحق نہیں بہایا جائے گا۔

غدر اور مثلہ کی ممانعت

جنگ میں خیانت، غدر اور دھوکہ عام بات ہوتی ہے۔ جنگ جو، جنگ کے دوران اپنے مخالف کو دھوکہ دینا اپنا حق سمجھتے ہیں، حتیٰ کہ وہ جنگ میں دھوکہ کو دھوکہ نہیں سمجھتے۔ اسی طرح عرب میں رائج تھا کہ جب وہ اپنے دشمن کو مارتے تو صرف اس کی جان لے کر ہی نہیں رک جاتے، بلکہ جوش انتقام میں اس کے جسم کے چیتھڑے اڑا دیتے، ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے، چہرہ بگاڑ دیتے، ایک ایک عضو کو کاٹ کر رکھ دیتے۔ اسلام نے جنگ میں رائج اس قسم کی تمام تر غیر انسانی اور خلاف اخلاق اعمال و حرکات کو یکسر ممنوع اور کالعدم قرار دے دیا۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں: اغْزُوا وَلَا تَغُلُّوا، وَلَا تَغْدِرُوا، وَلَا تُمَثِّلُوا. (۱) جنگ کے دوران خیانت اور دھوکہ دہی مت کرو، نہ لاشوں کا مثلہ کرو۔

واضح رہے کہ ایک ایسا دشمن جو آپ پر حملے کی تیاری میں ہو اور آپ کے ساتھ مکر و فریب کیے جا رہا ہو، آپ کو اپنے معتبر ذرائع سے اس کی توثیق ہے، پھر ایسے دشمن کے معاہدات کوئی قیمت نہیں رکھتے اور ایسوں پر حیلے بہانے سے حملہ آور ہونا یا ان سے جنگ جیتنا فریب میں شامل نہیں ہے۔ ان کے ساتھ ایسا عمل اپنا حق دفاع ہے جس کی احادیث میں توثیق کی گئی ہے۔

درختوں کے کاٹنے کی ممانعت

ماضی میں وحشی قوموں کا طریقۂ کار تھا کہ جب وہ حرب وضرب کے لیے کسی علاقے سے گزرتی تھیں تو وہاں کے باغات، کھیتیوں اور سبزہ زاروں کو بھی روندتے اور جلاتے چلے جاتے تھے، خصوصاً دشمن کے باغوں اور کھیتیوں کو نذر آتش کرنا اپنا حق سمجھتے تھے، لیکن اسلام نے جنگ میں بھی ایسی عمومی اور غیر ضروری تباہ کاری سے منع فرمایا۔ اس کے لیے سب سے پہلے ہم شجر کاری (plantation) اور سبزہ زاری (greenery) کے تعلق سے کتاب وسنت کے عمومی نصوص کو دیکھتے ہیں۔ اللہ کریم کا ارشاد ہے: وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا (الاعراف:۵۶) آباد و شاداب زمین میں تباہی مت پھیلاؤ۔

---

(۱) صحیح مسلم، كِتَابُ الْجِهَادِ وَالسِّيَرِ، بَابُ تَأْمِيرِ الْإِمَامِ الْأُمَرَاءَ عَلَى الْبُعُوثِ، وَوَصِيَّتِهِ إِيَّاهُمْ

دیگر مقامات پر اس نکتے کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لاَ يُحِبُّ الفَسَادَ (البقرة:۲۰۵)

ایسے منافق لوگ جب سامنے سے جاتے ہیں تو زمین میں فساد پھیلانے اور کھیتوں اور نسلوں کو تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ کریم فساد کو پسند نہیں فرماتا۔

قرآن کی اس آیت میں ایک باریک نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ جن افراد سے تمہارا مقابلہ ہے، ان سے تو جنگ کرو، لیکن ان کی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو مت مارو اور کھیتیوں کو تباہ مت کرو، یعنی: نسل انسانی کی افزائش اور اس کی ضرورتوں کی تکمیل کا باب ہمیشہ کھلا رہنا چاہیے۔ شجر کاری اور greenery کے حوالے سے یہ حدیث صحیح بھی بہت اہم ہے:

إِنْ قَامَت السَّاعةُ وَفِي يَد أَحَدِكُم فَسِيلةٌ فَإِنْ استَطاعَ أَنْ لَا تَقُومَ حَتى يَغرِسَهَا فَليَغرِسُهَا. (الادب المفرد، باب اصطناع المال)

اگر کسی کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پودا ہو اور قیامت قائم ہو رہی ہو تو اگر قیامت قائم ہونے سے قبل اس کا لگا دینا ممکن ہو تو وہ اسے لگا دے۔

امام ابوداؤد، نسائی اور بیہقی وغیرہ کی روایت کردہ یہ حدیث صحیح بھی اس سیاق میں انتہائی اہم ہے: من قطع سدرة صوب الله رأسه في النار. جو کوئی بیر کا درخت کاٹے گا، اللہ اس کا سر جہنم میں ڈال دے گا۔ اہل علم نے اس حدیث میں وارد عذاب کو راستوں میں واقع ان درختوں کے کاٹنے کی ممانعت پر محمول کیا ہے، جن کے سائے میں بیٹھ کر مسافر آرام کیا کرتے ہیں۔ بہر کیف! اس سے بلا وجہ درختوں کے کاٹنے کی ممانعت اور سبزے (greenery) کی حفاظت پر عمومی استدلال بھی کیا جاتا ہے۔

رسول انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد بھی اس سیاق میں ہمارے لیے چشم کشا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: مَنْ قَتَلَ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا، أَوْ أَحرَقَ نَخْلًا، أَوْ قَطَعَ شَجَرَةً مُثْمِرَةً، أَوْ ذَبَحَ شَاةً لِإِهَابِهَا لَمْ يَرْجِعْ كَفَافًا. **(مسند احمد بن حنبل، مِنْ حَدِيثِ ثَوْبَانَ) جس نے کسی چھوٹے یا بوڑھے کو قتل کیا، یا درخت کو نذر آتش کیا، یا پھل دار درخت کو کاٹا، یا کھال کی خاطر بکری ذبح کی، ایسے شخص کا کبھی پیٹ نہیں بھر سکتا۔**

اب رہا یہ سوال کہ اسلامی قانون میں دوران جنگ (war period) کے اصول کیا ہیں؟ کیا مذکورہ اصول دوران جنگ بھی کارآمد ہیں؟ اس کا جواب ہے کہ ہاں! یہ اصول عام اور محکم ہیں اور جنگی مواقع بھی ان سے مستثنیٰ نہیں ہیں، خصوصاً مذکورہ آخری حدیث کے الفاظ جنگی مواقع کی طرف ہی اشارہ کرتے ہیں۔ لہٰذا بنو نضیر کے محاصرے کے موقع پر بنو نضیر کے بعض درختوں کے جلائے جانے کا جو استثنائی اور شاذ واقعہ ملتا ہے، اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ جنگی تدبیر کے نقطۂ نظر سے ان کا جلانا ضروری تھا۔ ان درختوں کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کا قلعے تک پہنچنا آسان نہیں تھا، لہٰذا ان کا جلانا از راہ فساد نہیں بلکہ جنگی ضرورت کے تحت تھا اور جنگی حکمت عملی اور ضرورت کے تحت ایسے اضطراری اصول پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ مشہور علمی قاعدہ ہے: الضروراتُ تُبیحُ المَحظورات۔ ضرورتیں اضطراری حالات میں ممنوعات کو بھی مباح کر دیتی ہیں۔

آداب عشرہ

جنگی مواقع پر درختوں کے کاٹنے، جلانے اور کھیتیوں کے تاراج کیے جانے سے متعلق خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وہ معروف نصیحت بہت اہم ہے جو آپ نے شام کی طرف لشکر روانہ کرتے ہوئے کی تھی۔ آپ نے فرمایا:

یا أیها الناس قفوا أوصیكم بعشر فاحفظوها عني لا تخونوا ، ولا تَغُلُّوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ، ولا تقتلوا طفلا صغیرا ، ولا شیخا كبیرا ، ولا امرأة ، ولا تعقروا نخلا ، ولا تحرقوه ، ولا تقطعوا شجرة مثمرة ، وتذبحوا شاة ولا بقرة ولا بعیرا إلا لمأكلة ، وسوف تمرون بأقوام قد فرغوا أنفسه في الصوامع فدعوهم وما فرغوا أنفسهم له ، وسوف تَقدِمُون على أقوام یأتونكم بنیة فیها ألوان الطعام ، فإذا أَكَلتُم منها شیئا بعد شيء فاذكروا اسم الله علیه وسوف تلقون أقواما قد فحصوا اوساط رؤسهم وتركوا حولها مثل العصائب ، فاخفقوهم بالسیوف خفقا ، اندفِعوا باسم الله أغناكم الله بالطعن والطاعون. (۱)

اے لوگو! رکو! میں تمہیں دس باتوں کی نصیحت کردوں۔ میری یہ باتیں یاد رکھنا۔

---

(۱) کنز العمال، ح: ۳۰۲۶۸، از ابن عساکر

۱۔خیانت نہ کرنا،غنیمت میں کمی بیشی نہ کرنا،

۲۔دھوکہ مت دینا،

۳۔لاشوں کومثلہ مت کرنا،

۴۔کسی چھوٹے بچے کومت مارنا،نہ کسی بوڑھے مرد یاعورت کو مارنا،

۵۔باغات مت کاٹنا،نہ انہیں جلانا،

۶۔نہ کسی پھل داردرخت کوکاٹنا،

۷۔کھانے کی ضرورت کے علاوہ کسی بکری،گائے یااونٹ کوذبح مت کرنا۔

۸۔تمہارا سامنا کچھ ایسے لوگوں سے ہوگا جنہوں نے خودکوعبادت خانوں کے لیےوقف کررکھا ہوگا،انہیں ان کی حالت پرچھوڑ دینا۔

۹۔تم ایسے لوگوں سے بھی ملوگے جوتمہارے سامنے قسم قسم کے کھانے پیش کریں گے،اگرتمہیں ان میں سے کچھ کھانا پڑےتوبسم اللہ پڑھ کرکھالینا۔

۱۰۔تمہاری ملاقات ایسے دشمنوں سے بھی ہوگی جنہوں نے اپنے سرکادرمیانی حصہ مونڈ رکھا ہوگااوراس کے اطراف میں بال کے گچھے ہوں گے،ایسے لوگوں کواپنی تلواروں سے زیرکردینا۔

اللہ کا نام لےکرآگے بڑھو،اللہ تمہیں طعن اور طاعون سے محفوظ رکھے۔

پہلے خلیفہ راشد حضرت ابوبکررضی اللہ عنہ کے یہ دس نصائح آب زر سے لکھے جانے کے لائق اور جنگی حالات میں واجب العمل ہیں۔حدیث رسول بھی ہے:تم پر میرے اور میرے خلفائے راشدین کے طریقے کی پیروی واجب ہے۔(۱) یہ جنگی آداب کامختصر،جامع اور اخلاقی منشور ہے۔استثناءات سے قطع نظر،عام اسلامی حکام اسی پر عامل رہے ہیں۔ صدیق اکبرکایہ اخلاقی منشور The University of Minnesota Human Rights Center کی آن لائن لائبریری میں بھی محمود شریف کی''الوثائق الدولیۃ المعنیۃ بحقوق الإنسان'' کے حوالے سے موجود ہے۔

❁❁❁

---

(۱) عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ۔ احمد،ترمذی،ابن ماجہ،ابوداؤدوغیرہ،حدیث صحیح۔

حرف اختتام

علم الفقہ کی معروف شاخ علم مقاصد شریعت ہے۔ امام غزالی اور امام شاطبی نے پھر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بطور خاص اس فن کی تشریح وتفہیم میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ اس علم کے مطابق نزول شریعت کے جتنے مقاصد ہیں، ان سب کو سمیٹا جائے تو پانچ نقطوں پر جمع ہوجاتے ہیں:

۱۔حفاظت جان
۲۔حفاظت عقل
۳۔حفاظت دین
۴۔حفاظت نسل
۵۔حفاظت مال

اب غور کیجیے کہ جس دین کے نزول کا مقصد ہی ان پانچ امور کی حفاظت ہو، اس دین میں بدامنی ودہشت گردی کا گزر کہاں سے ہوسکتا ہے؟ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر ان پانچ نقاط کو ایک نقطے پر جمع کیا جائے تو وہ نقطہ محض ''قیام امن'' ہوگا۔ لہٰذا شریعت اسلامی کی دیگر تمام تعلیمات کے ساتھ مقصد جہاد بھی یہی ہے کہ مذکورہ پانچوں امور کی حفاظت ہو، یا دوسرے لفظوں میں روئے زمین پر امن وامان کا قیام ہو اور اس بات کو دنیا کے ہر ملک کا آئین تسلیم کرتا ہے۔

سابق مفتی جمہوریہ مصر مفتی علی جمعہ(۱) نے اس مقام پر ایک لطیف نکتے کا اضافہ کیا

---

(۱) دیکھیے: المدخل الی دراسۃ المذاھب الفقیۃ، الفصل الثامن، ہم یہاں ان کی فکر کی تلخیص وتوضیح وتعبیر اپنے الفاظ میں کر رہے ہیں۔

ہے۔انھوں نے کہا کہ سابق علما نے ان پانچوں امور کی ترتیب اپنے زمانے کے لحاظ سے کی ہے[1] اور ہم نے اپنے زمانے کے لحاظ سے کی ہے۔ ہمارا مقصد اسلاف کے بیان کردہ مقاصد سے اختلاف نہیں بلکہ فقط ان کی ترتیب اس انداز سے رکھنا ہے جو موجودہ عہد کے مطابق ہے اور حق کو بدلے بغیر، ہر زمانے کے فہم وتقاضے کے اعتبار سے اگر اس کی پیش کش کا انداز بدلا جائے تو یہ جرم نہیں ہوگا۔

ہماری ترتیب کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی شریعت کا مطلوب یہ ہے کہ سب سے پہلے لوگوں کی جانیں محفوظ ہوں۔ جان ہوگی تبھی جہان ہوگا۔ زندگی کے بعد سب سے پہلی چیز عقل ہے کہ اس کے بغیر ایک انسان اور ایک پتھر یا جانور برابر ہیں۔ دین ودنیا کے ہر خیر کا حصول اور ہر شر سے نجات اور خالق ومخلوق کے ساتھ ہر تعلق عقل کی سلامتی پر ہی موقوف ہے۔ اب اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ انسانی نسل بھی محفوظ رہے۔ اس کے بغیر فلاح دین ودنیا کا کارواں آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پھر یہ کہ اس کارواں کو آگے بڑھانے میں مال کی بھی ضرورت ہوگی، اس لیے مال کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ اس طرح ان پانچوں امور کی حفاظت سے عبادت حق اور تعمیر دنیا، دونوں کا قافلہ پر امن طریقے سے آگے بڑھتا رہے گا۔

مفتی علی جمعہ نے لکھا ہے کہ مقاصد خمسہ کی ہماری ترتیب انتہائی معقول اور منطقی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کا داخلی تعلق رعایت پر اور خارجی تعلق مفاہمت پر استوار ہے۔ یعنی جو غیر مسلم، مسلم ریاست کے شہری ہیں، ان کی پوری رعایت اور حفاظت کی جائے اور جو مسلم ریاست سے باہر ہیں، ان کے سامنے محبت کے ساتھ دین کی حقیقت پیش کی جائے۔ یعنی غیر مسلموں کو کسی صورت جبراً مسلمان نہیں بنایا جاسکتا اور نہ ان پر جنگ مسلط کی جاسکتی ہے۔ ہاں! اگر کوئی آزادی فکر وضمیر پر قدغن لگاتا ہے تب صورت حال مختلف ہوگی اور ممکنہ طور پر اس آزادی کے حصول کے لیے پوری جدو جہد کی جائے گی۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام محض مسلمانوں کے لیے ایک دین نہیں، بلکہ انسانی تہذیب وثقافت اور انسانیت کی حفاظت کا ذریعہ بھی ہے۔ اس کے سائے میں صرف وہی

---

[1] امام غزالی کی ترتیب یوں ہے: دین، نفس، عقل، نسل اور مال کی حفاظت۔

زندگی نہیں گزار سکتے، جنہوں نے اسلام قبول کرلیا ہے، بلکہ جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا ہے، اسلام ان کی جان ومال، فکرومذہب اور عقل ونسل کی حفاظت اور آزادی کا بھی ضامن ہے۔ المختصر! اسلام ایک مذہب بھی ہے اور ایک ریاست بھی ہے۔ اس کی تعلیماتِ عقائد وعبادات ان لوگوں کے لیے خاص ہیں جو مذہبی طور پر اسلام قبول کر چکے ہیں۔ لیکن ریاست کی سطح پر اسلام سب کے جملہ حقوق کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔ انہیں اس بات کا اختیار دیتا ہے کہ وہ زندہ رہیں اور اپنی آزادی فکروخیال کا استعمال کرتے ہوئے، جس مذہب کو چاہیں، اس کا انتخاب کریں اور مسلم ریاست کے ایک معزز شہری بن کر زندہ رہیں۔

ملک کے امن وامان کا مسئلہ کتنی اہمیت کا حامل ہے، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ شیخ ابن تیمیہ نے یہاں تک لکھا ہے کہ غیر مسلم عادل حاکم، مسلم ظالم حاکم سے افضل ہے۔ ظاہر ہے اس نظریے کی توجیہ یہی ہوسکتی ہے کہ عادل غیر مسلم حاکم اگرچہ دین اسلام سے باہر ہے، لیکن وہ فی الواقع تہذیب اسلامی کا کام کررہا ہے، کیوں کہ اسلامی تہذیب کی بنیاد ''عدل'' پر قائم ہے۔ اس کے برخلاف مسلم ظالم حاکم اگرچہ دین اسلام کا قائل ہے، لیکن چوں کہ وہ تہذیب اسلامی کی بنیاد ''عدل'' کے خلاف ہے، اس لیے وہ غیر مسلم عادل حاکم کے بالمقابل کمتر اور مفضول ہے۔

اس کی تائید مزید امام شعرانی کے اس ارشاد سے ہوتی ہے کہ جب مسلمان غیر مسلموں کی ریاست میں جائے تو اسے چاہیے کہ ان کے وہ قوانین جو خلاف شرع نہیں ہیں، ان کی پابندی کرے، کیوں کہ اللہ نے یہ قوانین انہیں تعمیر دنیا کے لیے الہام فرمائے ہیں۔

مفتی جمہوریہ کے حوالے سے مقاصد شریعت کی جو ترتیب اوپر مذکور ہوئی اس پر ایک اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اس ترتیب میں جان کی حفاظت کو دین کی حفاظت پر مقدم رکھا گیا ہے، جب کہ مسئلۂ جہاد سے واضح ہوتا ہے کہ دین کی حفاظت جان کی حفاظت پر مقدم ہے، جب ہی تو ایک انسان دین کی حفاظت کے لیے بخوشی اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیتا ہے۔

مفتی صاحب نے اس کا جواب بہت ہی خوب صورت دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ بحیثیت مسلمان مجھے مطلقاً دین کے لیے جان کی قربانی کا حکم نہیں ہوا ہے، بلکہ مجھے جان کی حفاظت کا حکم ہوا ہے۔ حضرت عمار بن یاسر کا اپنی جان کی حفاظت کے لیے زبان سے

کفر بولنا یہی ثابت کرتا ہے۔ البتہ بعض حالات ایسے ہوتے ہیں جب بہت سی جانوں کی حفاظت کے لیے کچھ جانوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اس طرح وہاں بھی اصل مقصود جان کو ہلاک کرنا نہیں، بلکہ جان کو بچانا ہوتا ہے۔

المختصر! حکم جہاد کا مقصد جان کو ہلاک کرنا نہیں، جان کو بچانا ہے، البتہ مسئلہ یہ ہے کہ بعض نازک صورت حال ایسے پیش آجاتے ہیں، جب پورے ملک اور پوری ریاست کی حفاظت کے لیے ہمیں نکلنا پڑتا ہے، اس میں ہلاکتِ جان یقینی نہیں بلکہ متوقع ہوتی ہے۔ اس لیے ہمارا نکلنا دراصل اپنوں کی حفاظت کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ اپنی ہلاکت کے لیے۔ ہاں! ایسا ہوسکتا ہے کہ بعض دفعہ اپنی ہلاکت بھی ہوجائے۔

الغرض! بہت سی جانوں کو بچانے کے لیے کچھ جانوں کی قربانی دینے کا نام جہاد ہے۔ بلفظ دیگر مصلحت عامہ اور مصلحت خاصہ کے تصادم کے وقت انصاف اور دانائی یہ ہے کہ مصلحت خاصہ سے دست بردار ہوا جائے اور مصلحت عامہ کو ترجیح دی جائے۔ جہاد کی مشروعیت میں یہی اصول کارفرما ہے اور پوری دنیا کی defence policy اسی اصول پر قائم ہے۔

پس نوشت

۳؍ مارچ ۱۹۲۴ء کو کمال اتاترک (۱۹۳۸ء) نے باضابطہ طور پر عثمانی خلافت کے خاتمے کا اعلان کردیا۔ اس کی تیاری تو سالہا پہلے شروع ہوگئی تھی، مگر جب یہ اعلان سامنے آیا تو عالم اسلام ہِل کر رہ گیا۔ اہل اسلام کے لیے یہ کوئی عام سی خبر نہیں تھی، بلکہ ان کے تیرہ سو سالہ سیاسی تفوق کے انہدام اور مستقبل میں سیاسی بے سمتی کا اعلامیہ تھی۔ اہل نظر کے اوسان خطا ہوگئے، مسلم ذہن یاسیت کا شکار ہوا تھا، تعمیر نو کی فکر جاگی اور اس پیچ ردعمل کی نفسیات کے تحت بہت سے بڑے مسلم دماغوں نے مسلمانوں کی سیاسی بالادستی اور دین کی سیاسی تعبیر و تشریح کا کام شروع کردیا۔

اسی عہد میں اشتراکیت، سرمایہ داریت اور جمہوریت جیسے جدید مغربی نظریات دنیا میں چھاتے چلے جارہے تھے، یہاں تک کہ اہل مشرق اور عالم عرب کے لیے بھی اس میں انتہائی درجے کی کشش محسوس ہورہی تھی۔ یہ نظریات نہ صرف سیاسی سطح پر بلکہ تہذیبی و ثقافتی اور معاشی و تمدنی سطح پر بھی اسلام کے سامنے چیلنجز بن کر کھڑے ہوگئے۔ اس عہد کے مسلم اشرافیہ۔ جس سے ان چیلنجز کے علمی و عملی جواب کی توقع کی جاسکتی تھی۔ کو حسب ذیل خانوں میں رکھ کر دیکھا جاسکتا ہے:

الف۔ مسلم سلاطین وزعما، ان کے لیے اپنی لنگوٹ کو سنبھالنا ہی مشکل ہورہا تھا، چہ جائے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے کسی ہمہ گیر اقدام کی سوچتے۔

ب۔ روایتی علما، یہ اپنی روایات کے تحفظ اور جدید سوالات سے چشم پوشی کی روش پر قائم تھے، حالاں کہ شتر مرغ کے ریت میں سر چھپا لینے سے کہیں طوفان نہیں تھم جایا کرتا۔

ج۔مغرب پرست علما، جوتاویل درتاویل کے ساتھ معذرت خواہانہ اسلوب میں اپنی اوراسلام کی صفائی دیتے تھک نہیں رہے تھے۔

د۔جدید وقدیم سے واقف، مغرب آشنا مشرق پسند علما، جومغربی فکر وفلسفے کے بالمقابل اسلامی فکر وفلسفے کی صداقت کا اعلان پوری قوت واعتماد سے کررہے تھے۔سرمحمد اقبال (۱۸۷۷۔۱۹۳۸ء) کا نام اس سیاق میں بطورخاص لیا جاسکتا ہے۔لیکن ظاہر ہے کہ ان کے فکر وتخیل کا ساراز ورشعروسخن کی انجمن آرائی تک محدود تھا۔ان کے پاس اپنی فکر کے نفاذ لیے کوئی عملی منصوبہ بندی نہیں تھی۔

پوری دنیا کے خلاف جنگ

اس سیاق میں دو نام بطورخاص قابل ذکر ہیں؛ ہندوستان میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳۔۱۹۷۹ء)اور عالم عرب میں سید قطب مصری(۱۹۰۶۔۱۹۶۶ء)۔ہم عصروہم خیال، ادیب ومفکراور جدید عہد میں ''سیاسی اسلام'' کے نظریے کے بنیادگذار۔ان دونوں شخصیتوں نے جمہوری، اشتراکی اورسرمایہ دارانہ نظام کے بالمقابل اسلام کوایک جامع نظام حیات کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔اس کے لیے انہوں نے اسلام کی جہادی فکر کی نئی تشکیل کی اور ہمہ گیرسیاسی انقلاب کا نظریہ پیش کیا، جوان کی نظرمیں ''احیاے دین'' کا کام تھا۔مولانا وحیدالدین خان کی صاحب زادی ڈاکٹر فریدہ خانم اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے ''مولانا مودودی۔شخصیت اورتحریک، ایک علمی جائزہ'' (ص:۸) میں رقم طراز ہیں:

> ''مولانا[مودودی] کی فکری اورشعوری نشوونما ایسے زمانہ میں ہوئی جب کہ ایک طرف مسلمانوں کی سیاسی طاقت مکمل طور پر ٹوٹ چکی تھی اورتہذیبی اعتبار سے وہ ساری دنیا میں بالکل مغلوب ہوگئے تھے، دوسری طرف پورے عالم اسلام میں مسلمانوں کے احیائے نو کے لیے مختلف قسم کی سیاسی اور مذہبی تحریکیں چل رہی تھیں۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ مولانا مودودی کا فکر، اپنے تشکیلی دور میں، اس ماحول سے متاثر ہوا۔تاہم انہوں نے اپنے وقت کے تمام فکری اورتحریکی رجحانات سے ایک یا دوسرے پہلو سے اختلاف کیا اور یہ کوشش کی کہ اسلام اورملت اسلامیہ کے احیاء کے لئے زیادہ جامع، ہمہ گیراورانقلابی نظریہ پیش کریں۔''

مولانا مودودی کی معروف زمانہ تصنیف ''الجہاد فی الاسلام'' ان کی اسی فکر کی پیداوار ہے۔اس کا خلاصہ خود ان کے لفظوں میں یہ ہے کہ ''مسلمان دراصل نام ہی اس بین الاقوامی گروہ کا ہے جسے دنیا میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے کے لیے وجود میں لایا گیا ہے اور یہ فریضہ حکومت باطل کو مٹا کر ان [اس] کی جگہ حکومت الٰہیہ قائم کئے بغیر ادا نہیں ہوسکتا۔'' اپنی دوسری کتاب ''تنقیحات'' کی تلخیص یوں کرتے ہیں کہ کافرانہ وفاسقانہ نظام کے ''اس ہمہ گیر تسلط کو مٹا کر جب تک اسلام کا ہمہ گیر تسلط قائم کرنے کے لیے کام نہ کیا جائے گا، کسی مذہبی حرکت وعمل سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوسکے گا۔''(۱)

مولانا مودودی کی اس فکر پر مولانا یحییٰ نعمانی کا یہ تبصرہ انتہائی برمحل معلوم ہوتا ہے کہ ''جہاد کی یہ تعبیر اور اسلامی احکام کی یہ تشریح کہ مسلمانوں کو مشرق ومغرب کے ہر کالے گورے غیر مسلم ملک پر، چاہے وہ جنگجو ہو یا صلح کرنا چاہے، جنگ مسلط کرنے کا حکم ہے، یہ اسلام دشمن لابیوں کی خدمت انجام دینا ہے کہ وہ مسلمانوں کی دشمنی پر ساری دنیا کو متحد کریں۔''(۲)

مولانا نعمانی نے مودودی صاحب کی اس تفسیر جہاد کی وجہ یہ بتائی ہے کہ دراصل مولانا ہفتہ وار اخبار الجمعیۃ میں قسط وار لکھتے تھے اور اتنا وقت نہیں پاتے تھے کہ وہ پورے اطمینان کے ساتھ اس پر غور وخوض اور نظر ثانی کرسکیں، طرفہ یہ کہ عمر بھی کم تھی، یعنی وقت تحریر مولانا مودودی ابھی تیس سال کے بھی نہیں ہوئے تھے۔اسی کا نتیجہ ہے کہ کتاب میں آبشار جیسا جوش وروانی تو ہے، لیکن مطلوبہ سنجیدگی اور دقت نظری کا فقدان ہے۔(ایضاً،ص:۷۶)

مسلمانوں کی سیاسی تکفیر

ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے سید قطب کی ''معالم فی الطریق'' کے تکفیری رجحانات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ موجودہ مسلمانوں کی تکفیر کی فکر صرف معالم فی الطریق میں نہیں ہے بلکہ اس کی اصل فی ظلال القرآن اور العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام ہے۔(۳)

---

(۱) مولانا مودودی۔شخصیت اور تحریک، ایک علمی جائزہ، ص:۱۳۱، بحوالہ مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں

(۲) جہاد کیا ہے؟، ص:۷۰

(۳) ابن القریۃ والکتاب، ملامح وسیرۃ، جلد:۳، ص:۶۹، دار الشروق، قاہرہ، ۲۰۰۸ء

ڈاکٹر اسامہ ازہری کی کتاب ''الحق المبین'' کی تلخیص میں مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی نے مزید انکشاف کیا ہے کہ سید قطب نے یہ فکر اصلاً مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے لے کر اس کو مزید ترقی دی اور اپنی زور بیانی سے اسے ایک مکمل نظریہ بنا دیا اور پھر یہ نظریہ ایسا ناسور بن گیا جس سے تکفیر کا مواد رسنے لگا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قطب نے اس فکر کی بنا قرآن کریم کی جس آیت کریمہ پر رکھی وہ یہ ہے: وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۤـئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ. (مائدہ: ۴۴)(جو اللہ کی نازل کردہ شریعت کو اپنا حاکم نہ بنائیں وہ کافر ہیں۔)

اس آیت کریمہ سے سید قطب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر کوئی شخص شرعی احکام کا نفاذ نہیں کرتا تو وہ ان احکام کی حقانیت کا عقیدہ رکھنے والا ہی کیوں نہ ہو اور ان احکام کے عدم نفاذ کی وجہ کوئی عذر ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی وہ کافر ہے۔

یہ ایک انتہا پسندانہ فکر ہے، جس سے دین کا زاویہ بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ اس سے غلو فی التکفیر اور جہاد کے نام پر فساد کا دروازہ کھلتا ہے۔ یہ دراصل خوارج کا انداز نظر ہے، جب کہ عہد صحابہ سے ہی امت اسلامیہ کا مذہب اس کے خلاف رہا ہے۔

آیت کریمہ کی یہی توضیح بے شمار علمائے سلف نے کی ہے۔ ان تمام ائمہ کے بالمقابل مولانا مودودی اور سید قطب ہیں جنھوں نے بیک جنبش قلم ان تمام ائمہ کی تفہیم کو تحریف قرار دے دیا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس فکر میں خوارج کے سوا ان کا کوئی پیش رَو نہیں ہے۔ اسی الٹی فکر کا اثر ہے کہ شدت پسند جماعتوں کا یہ ماننا ہے کہ مسلمانوں نے ربانی نظام کی حاکمیت کو چھوڑ کر طاغوتی حاکمیت قبول کر لی ہے، جن سے نہ لڑنا رضا بالشرک ہے۔

ڈاکٹر اسامہ ازہری کے مطابق حاکمیت کا فلسفہ خوارج الفکر تحریکات کا اساسی فلسفہ ہے۔ اسی پر ان کے دیگر تمام غلط افکار کا دارومدار ہے۔ اس فلسفے سے سید قطب اور ان کے بھائی محمد قطب کے یہاں شرکیہ حاکمیت اور توحیدی حاکمیت کی فکر پیدا ہوئی اور پھر یہیں سے مومنانہ جہادی گروہ کی ضرورت اور پھر ان کے لیے نصرت و تمکین کے وعدۂ الٰہی کی فکر کا ظہور ہوا اور اسی فکر کی بنا پر عام مسلمانوں کی حالت کو جاہلیت کی حالت قرار دیا گیا اور

ان مسلمانوں کی تکفیر کی گئی۔یہیں سے یہ فکر سامنے آئی کہ ان کے نام نہاد مومنانہ جہادی گروہ کو جاہلیت میں مبتلا مسلمانوں پر غلبہ ہونا چاہیےاور یہ خیال بھی عام ہوا کہ ایسے مسلمانوں سے تصادم ضروری ہے تا کہ خلافت الٰہیہ قائم کی جاسکے۔

غلط استدلال

قرآن مقدس میں تین مقامات پر یہ آیت کریمہ وارد ہے:إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ. حکم تو صرف اللہ کا ہے۔سورۂ انعام(۵۷)اورسورۂ یوسف(۴۰-و-۶۰) ۔ ان تینوں کا سیاق عقیدہ اورعبادت سے متعلق ہے، نہ کہ حکومت اور سیاست سے، اگر چہ عموم لفظ کا لحاظ کرتے ہوئے اہل ایمان کے حق میں اس سے ''سیاسی حاکمیت'' مراد لینا بھی درست ہے، لیکن اس کے قطعی یہ معنی نہیں ہوں گے کہ اعتقادی،عباداتی یا سیاسی حاکمیت کو دوسروں پر بھی بالجبر نافذ کیا جائے۔

یہ وہم آیت کریمہ لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ(دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔ البقرۃ:۲۵۶) سےصراحت اوروضاحت کےساتھ مسترد کردیا گیاہے۔حاکمیت الہٰ کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ تمام احکام کے تمام جزئیات کتاب اللہ میں بالتصریح موجود ہیں اور باب حکم وقضا میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہے، یہاں تک کہ کسی بھی معاملے کی تحقیق وتفتیش اگرکسی فرد یا جماعت کے حوالے کی جاتی ہے، یا کسی بھی خطۂ زمین پر کسی غیر مسلم حاکم کے زیر اقتدار شہریت اختیار کی جائے تو اسے بھی حاکمیت الٰہ کے خلاف اورشرک فی الحاکمیت کے ہم معنی سمجھا جائے۔

دین میں اس قسم کی غیر علمی نکتہ آفرینی سب سے پہلے ہمیں خوارج کے یہاں ملتی ہے۔ ۳۷ھ میں مقام صفین پر جب حضرت علی -کرم اللہ وجهہ-اور حضرت معاویہ-رضی اللہ عنہ- نے نزاعات کے تصفیہ کے لیے بطور حکم حضرت عمرو بن العاص اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کو نامزد کیا تو خوارج نے اسی آیت کریمہ ''إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ'' کو بنیاد بنا کر شرک فی الحاکمیت کے الزام کے تحت ان حضرات کرام پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔خوارج کی یہ فکر وقفے وقفے سے سر اٹھاتی رہی، یہاں تک کہ بیسویں صدی میں عالم اسلام میں جو احیاپسند تحریکیں اٹھیں، وہ بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اس خارجی فکر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

برا انجام

علامہ ڈاکٹر ربیع جوہری کا شمار ازہر کے اکابر متکلمین میں ہوتا ہے۔ جامعہ ازہر میں وہ ہمیں عقیدہ پڑھاتے تھے۔ انھوں نے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح کتاب وسنت میں مجاز کا قضیہ ہے، جس کو عقلی سطح پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ارباب ظواہر کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ حقیقت ومجاز کی لطافتوں کو نہیں سمجھتے۔ علامہ ابن تیمیہ کے ساتھ یہی مسئلہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ الٹے انہوں نے اشاعرہ اور ماتریدہ کو اہل ضلال میں شامل کر دیا، یا تکفیر کر دی۔ اس کے باوجود علامہ ابن تیمیہ ایک عالم شخصیت تھے، انھوں نے اس مسئلے کو علمی طور پر دیکھا۔ بعد میں یہ مسئلہ شیخ محمد ابن عبدالوہاب کے ہاتھ لگ گیا۔ موصوف ایک معمولی شد بد کے مولوی تھے، جیسے ہمارے یہاں مسجدوں کے بعض ائمہ ہوتے ہیں جو اصلاحی مزاج رکھتے ہیں۔ اب انھوں نے ان مسائل کو بعض کتابچوں میں لکھا جو یقیناً عوامی نوعیت کے ہیں۔ پھر اس میں ایسی شدت پر آ گئے کہ اپنے فہم کے خلاف والوں کو کافر ومشرک سمجھنے لگے۔ اتفاق سے انہیں ابن سعود کی تلوار بھی مل گئی۔ پھر یہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی اور ایک الگ راہ چل پڑی۔

اب اس سے بڑا مسئلہ یہ ہوا کہ جب اس فکر کا ایک جتھہ بن گیا تو یہ جتھہ شیخ ابن عبد الوہاب کو بجائے ایک مصلح کے، ایک طرح سے نبی بنا لیا اور ان کی معمولی کتابوں اور عبارتوں اور ان کی علمی وفکری خطاؤں کو بھی اپنے لیے سند کا درجہ دے دیا۔ شیخ کے کتابچے چھاپے گئے اور ان کی ضخامت بڑھانے کے لیے تخریج کے نام پر بلاوجہ صفحات سیاہ کیے گئے۔ مثلاً انھوں نے ایک حدیث نقل کی، جو بخاری میں موجود ہے۔ آپ تخریج میں بخاری لکھ دیں، کافی ہے، لیکن کتاب کو موٹی کرنے کے لیے ان ساری کتابوں، ان کے ابواب اور صفحات کی تفصیل لکھ دی گئی، جہاں جہاں وہ حدیث موجود ہے۔ آپ حضرات حسن بن فرحان مالکی کی کتاب **داعية و ليس نبياً** پڑھیں۔ شیخ اور ان کے متبعین کے منہج فکر وعمل سمجھنے کے لیے یہ ایک بہترین کتاب ہے۔

استاذ محترم اس کے بعد داعش جیسی تنظیموں پر آئے اور کہا کہ یہ اسی فکر کی انتہائی شکل ہے اور یہ کہتے ہوئے آب دیدہ ہو گئے کہ یہ مسلم بچوں اور عورتوں کو مارتے ہیں، یہاں تک کہ ایسے اکابر علما ومشائخ کو کافر ومشرک کہہ کر ذبح کر دیتے ہیں، جو یقیناً صالح اور مستجاب ہیں۔ یہ کون سا دین ہے اور یہ کون سے اسلام کی خدمت ہے؟

جدید تصور جہاد کی تباہ کاریاں

جہاد کے بدلے ہوئے مفہوم نے روے زمین پر کیا تباہی مچائی اور مسلم وغیر مسلم دنیا اس سے کس طرح سے متاثر ہوئی، اسباب ووجوہات کے ساتھ اس کا ایک نقشہ مولانا یحییٰ نعمانی کے اس بیان میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے:

''ایک طرف ''اسلامی جہاد'' کو بدنام کرنے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے دلوں میں قرآن اور اسلامی تعلیمات سے بدظنی پیدا کرنے کی ہر سو پھیلی ہوئی مہم ہے، دوسری طرف حالات کے جبر اور رد عمل کی نفسیات کے مارے ہوئے یا انتہا پسندانہ سوچ کے شکار وہ ناسمجھ ہیں، جن کو عالمی ایجنسیاں استعمال کر رہی ہیں یا جو اسلامی جہاد کی بدنامی اور مسلمانوں کے مسائل کو بری طرح الجھانے کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

ان لوگوں نے جہاد کے شرعی قوانین کو کھلے طور پر نظر انداز کر کے اندھادھند قتل وخوں ریزی کو جہاد سمجھ رکھا ہے۔ وہ نہ علماء کی بات سننے کو تیار ہیں اور نہ ٹھنڈے دماغ سے قرآن وسنت کی تصریحات اور موجودہ حالات کی نزاکتوں اور اپنے عاقبت نااندیش اقدامات کے نتائج پر نگاہ کرنے کو تیار ہیں۔ ان لوگوں نے جن کو اپنا فکری راہ نما اور قائد بنایا ہوا ہے وہ عام طور پر گہرے شرعی علم اور اسلام کے اصل مآخذ کے وسیع مطالعہ سے محروم ہیں۔'' (جہاد کیا ہے، ص: ۳۰)

جہاد کے بدلے ہوئے مفاہیم ومقاصد کے اثرات کیا ہوئے، اس تعلق سے مولانا وحید الدین خان کا یہ اقتباس چشم کشا ہے:

''دین میں اصل اہمیت تواضع کی نفسیات کی ہے، مگر جہاد کا مذکورہ نظریہ اس کے برعکس، سرکشی کی نفسیات پیدا کر دیتا ہے۔ اس میں دین کا روحانی پہلو غائب ہو جاتا ہے اور سیاسی پہلو غیر متناسب طور پر ابھرتا ہے۔ جن لوگوں کا مزاج اس نظریہ کے تحت بنتا ہے، ان کی نظریں داخلی احتساب سے ہٹ جاتی ہیں اور ساری توجہ خارجی احتساب کی طرف چلی جاتی ہیں۔ ایسا آدمی عین اپنے مزاج کے مطابق اپنی ذات پر لفظی تنقید بھی برداشت نہیں کرے گا اور دوسروں کے اوپر گولی

اور بم کی بارش کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھے گا۔ تعمیری میدان میں سرگرم ہونا اس کو غیر اہم نظر آئے گا، البتہ تخریب کے پروگرام سے اس کو بہت زیادہ دل چسپی ہوگی۔''

(کاروان ملت، مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی، ص: ۵۰، ۵۱)

ایک دوسرے مقام پر مولانا نے اس حوالے سے آخری بات کہہ دی ہے، جو بہر حال قابل غور ہے۔ رقم طراز ہیں:

''۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء سے پہلے اور ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد دنیا کے مختلف مقامات پر اسلام کے نام سے جو بھیانک تشدد ہوا یا ہو رہا ہے، وہ براہ راست یا بالواسطہ طور پر انہی دونوں نام نہاد انقلابی تحریکوں [جماعت اسلامی اور اخوان المسلمین] کا نتیجہ ہے۔'' (امن عالم، ص: ۹۷)

برصغیر ہند و پاک میں مولانا مودودی کے بعد مولانا وحیدالدین خان اور پھر جناب جاوید احمد غامدی نے اس مورچے کو سنبھالا اور جہاد کے بدلے ہوئے مفہوم کو صحیح سمت دینے کی کوشش کی، مگر افسوس کہ ان کی توضیح بھی جدید ذہن کی تفہیم جہاد کے حوالے سے ہنوز نامکمل ہے، بلکہ ان کی بعض تشریحات ایسی ہیں جن سے معترضین کی باتوں کی مزید توثیق ہوتی ہے۔ پیش نظر تحریر دراصل اسی خلا کو پر کرنے کی ایک حقیر سی کوشش ہے۔

ضمیمہ

دہشت پسند تنظیموں کی فکری بنیادیں

’’مولانا محمد ضیاء الرحمٰن علیمی دینی علوم اور عصری شعور کے حامل ایک باصلاحیت عالم دین ہیں۔ اس وقت جامعہ عارفیہ اور شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں کے تدریسی و تحقیقی شعبوں سے وابستہ ہیں۔ ان کا یہ مقالہ دراصل ڈاکٹر اسامہ ازہری کی کتاب ’’الحق المبین فی الرد علی من تلاعب بالدین‘‘ کا خلاصہ ہے۔ یہ سب سے پہلے صوفی کانفرنس دہلی منعقدہ ۱۷ تا ۲۰ / مارچ ۲۰۱۶ء کے موقع پر انٹرنیشنل صوفی سیمینار میں پڑھا گیا۔ اس موقع سے شائع ہونے والے تاریخی مجموعۂ مقالات ’’اکیسویں صدی میں تصوف: عالمی بحران کے حل کی تلاش‘‘ میں بھی یہ شامل ہے۔ تفہیم جہاد کے حوالے سے اس کی منفرد اہمیت کے سبب نظر ثانی کے بعد اس کی تلخیص شامل کتاب کی جارہی ہے۔‘‘ ذ۔ا۔ مصباحی

شدت پسند تنظیموں کی فکری بنیادیں-ایک علمی مطالعہ

مولانا محمد ضیاء الرحمٰن علیمی

جتنے بھی مسلم فرقے ہیں سب اپنا رشتہ قرآن وسنت سے جوڑتے ہیں اورسب کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کا عقیدہ و منہج قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ایسے میں سے اسلاف کے فراہم کردہ اصول ومعیار پر ایسے تمام فرقوں کے افکار ومفاہیم کا تجزیہ کرنا ایک دینی ذمے داری اور علمی امانت داری بھی۔

جامعہ ازہر عالم اسلام کی وہ عظیم دانش گاہ ہے جس نے دین وملت کی خدمت میں اپنی زندگی کے پورے ایک ہزار سال گزارے ہیں،اس نے ہر زمانے میں باطل افکار و خیالات کو اسلاف کے عطا کردہ اصولوں پر پرکھ کر گمراہ فرقوں کو آئینہ دکھایا ہے اور قرآن وسنت سے ان کے گہرے رشتوں کے دعوے کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔اسی دانش کدے کے پروردہ ڈاکٹر اسامہ السید محمود ازہری (ولادت:١٩٧٦ء) بھی ہیں جن کا لائف ٹائم مشن ہی یہ ہے کہ ازہر کے علمی منہج کا احیا کیا جائے۔اسلام کی صحیح،معتدل،متوازن اور پُرامن متوارث تفہیم کو عام کیا جائے اور ہر اس تفہیم کو مسترد کر دیا جائے جس میں دین اسلام کو ایک پُرتشدد،غیر معتدل اور عقل وفطرت سے برسر پیکار دین کے طور پر پیش کیا گیا ہو۔

ڈاکٹر موصوف کی کتاب ''الحق المبین فی الرد علی من تلاعب بالدین'' ایسی ہی ایک علمی وتجزیاتی کاوش ہے،جس میں اخوان المسلمین سے لے کر داعش تک دین کے نام پر جذبات کا استحصال کرنے والی دہشت وخوں ریزی کی سوداگر تنظیموں کو اسلاف کے ان رہنما اصول اور علمی معیار کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا گیا ہے اور دین اسلام جو اپنے

نصوص و مفاہیم کے ساتھ متوارث و متواتر ہے، اس کی عدالت میں ان کے افکار کا مقدمہ رکھ کر انصاف کی فریاد کی گئی ہے۔

مصنف کتاب نے تشدد کی علم بردار اُن جماعتوں کی فکری اساس کی تلاش و جستجو میں جن بنیادی افکار کو موضوع گفتگو بنایا ہے، وہ درج ذیل ہیں:

(۱) غیر اللہ کی حاکمیت قبول کرنے کا مسئلہ (۲) جاہلیت کا مفہوم (۳) دار الاسلام اور دار الکفر کا مفہوم (۴) فتح و نصرت کے وعدے صرف جہادیوں کے لیے (۵) جہاد کا مفہوم (۶) تمکین کا مفہوم (۷) وطن کا مفہوم (۸) اسلامی غلبے کا مفہوم۔

ان افکار کے صحیح و غلط پہلو اور پھر ان کے سنگین نتائج پر شریعت اسلامی اور مسلک اسلاف یعنی منہج ازہری کی روشنی میں تفصیلی بحث کے بعد ان قواعد کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کو بروئے کار نہ لانے کی وجہ سے مذکورہ بالا عناوین کے صحیح و متوارث مفاہیم تک ان تحریکوں کی رسائی نہیں ہو سکی۔ آنے والی سطور میں درج بالا عناوین کے مفاہیم پر مصنف کی گفتگو کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ غیر اللہ کی حاکمیت؟

متشدد جماعتوں کا نظریہ ہے کہ مسلمانوں نے ربانی نظام کی حاکمیت کو چھوڑ کر دوسرے قوانین کی حاکمیت قبول کر لی ہے اور یہ شرک ہے، مؤلف کے مطابق یہ سب سے اساسی فکر ہے اور اسی پر دوسرے تمام غلط افکار کا دارومدار ہے۔ اس فکر سے سید قطب اور ان کے بھائی محمد قطب کے یہاں شرک حاکمیت اور توحید حاکمیت کی فکر پیدا ہوئی اور پھر یہیں سے ’’مومنانہ جہادی گروہ‘‘ کی ضرورت اور پھر ان کے لیے نصرت و تمکین کے وعدۂ الٰہی کی فکر کا ظہور ہوا اور اسی فکر کی بنا پر عام مسلمانوں کی حالت کو جاہلیت کی حالت قرار دیا گیا اور ان مسلمانوں کی تکفیر کی گئی۔ یہیں سے یہ فکر سامنے آئی کہ ان کے مزعومہ ’’مومنانہ جہادی گروہ‘‘ کو جاہلیت میں مبتلا مسلمانوں پر غلبہ حاصل ہونا چاہیے اور یہ خیال بھی عام ہوا کہ ایسے مسلمانوں سے ٹکراؤ ضروری ہے تا کہ خلافت الٰہیہ قائم کی جا سکے۔

حاکمیت کی فکر کہاں سے پیدا ہوئی اور پھر اس فکر سے دوسری فکری کج رویاں کیسے سامنے آئیں اس حوالے سے مؤلف کا یہ کہنا ہے کہ اس طرح کے تمام افکار و خیالات کا

سرچشمہ سید قطب کی کتاب فی ظلال القرآن ہے اور اُن کی جو دوسری کتابیں ہیں دراصل وہ فی ظلال القرآن میں مندرج افکار وخیالات کا ہی چربہ ہیں۔

سید قطب نے یہ فکر اصلاً مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے لے کر اس کو مزید ترقی دی اور اپنی زور بیانی سے اسے ایک مکمل نظریہ بنا دیا اور پھر یہ نظریہ ایسا ناسور بن گیا جس سے تکفیر کا مواد رسنے لگا۔ مولانا مودودی اور سید قطب نے اس فکر کی بنا قرآن کریم کی اس آیت کریمہ پر رکھی جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ. (مائدہ: ۴۴)

[جو اللہ کی نازل کردہ شریعت کو اپنا حاکم نہ بنائیں وہ کافر ہیں۔]

اس آیت کریمہ سے سید قطب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر کوئی شخص شرعی احکام کا نفاذ نہیں کرتا تو وہ ان احکام کی حقانیت کا عقیدہ رکھنے والا ہی کیوں نہ ہو اور ان احکام کا عدم نفاذ کسی عذر کے سبب ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی وہ کافر ہے۔

اس فکر اور نظریے میں بڑی شدت اور بڑی تنگی ہے، اس میں تکفیر کے لیے عجلت پسندی اور باب تضلیل کی توسیع ہے، اس فکر کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مسئلہ حاکمیت کو اصول ایمان سے سمجھ لیا گیا، اس طرح عقیدے کے باب میں ایک امر کا اضافہ ہوا اور پھر اس کے فقدان کی صورت میں مسلمانوں کی تکفیر کر دی گئی۔ یہ بعینہٖ خوارج کا مذہب ہے، جب کہ صحابہ کے زمانے سے لے کر بعد کے ادوار تک مسلم علما کا مذہب اس کے خلاف ہے۔ مذکورہ بالا آیت کریمہ کی توجیہ وتفہیم میں متعدد اقوال ذکر کیے گئے ہیں۔ ان میں راجح ترین قول وہ ہے جسے امام رازی نے تفسیر کبیر میں حضرت عکرمہ سے یوں نقل کیا ہے:

> حضرت عکرمہ فرماتے ہیں کہ کافر ہونے کا حکم ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ کے نازل کردہ احکام کی حاکمیت کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار نہ کریں، چنانچہ جو شخص حکم الٰہی کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کرتا ہو لیکن اس کا عمل اس کے برخلاف ہو تو وہ احکام الٰہی کی حاکمیت قبول کرنے والا ہے اگرچہ ترک عمل میں گرفتار ہے، ترک عمل کی بنا پر وہ اس کے حکم کے تحت یقیناً داخل نہیں ہوگا، یہی صحیح جواب ہے۔ (تفسیر کبیر/ ۶ / ۳۵، دار الغد العربی، قاہرہ، ۱۴۱۲ھ)

آیت کریمہ کی یہی توضیح امام غزالی نے المستصفی میں اور امام ابن عطیہ اندلسی نے المحرر الوجیز میں کی ہے، اور کلام ائمہ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن مسعود، ابن عباس، براء بن عازب، حذیفہ بن الیمان، ابراہیم نخعی، سدی، ضحاک، ابوصالح، عکرمۃ، قتادہ، عامر، شعبی، عطاء، طاؤس، طبری، قرطبی، ابن جوزی، ابو حیان، ابن کثیر، آلوسی، طاہر بن عاشور اور شیخ شعراوی جیسے تمام ائمہ اعلام نے آیت کریمہ کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔

ان تمام ائمہ کے بالمقابل سید قطب ہیں جنھوں نے بیک جنبش قلم ان تمام ائمہ کی تفہیم کو تحریف قرار دے دیا، اس فکر میں خوارج کے سوا ان کا کوئی پیش رو نہیں ہے۔ سید قطب اس طرح کی فاش غلطی کا شکار اسی بنا پر ہوئے کہ انھوں نے فہم وحی کے سلسلے میں علمائے اسلام کے تجربے سے روگردانی کی اور ان کے مناہج فہم کی پیروی نہیں کی بلکہ ملت اسلامیہ کے پورے فکری سرمائے کو جاہلی ثقافت قرار دے دیا اور فہم وحی کے سلسلے میں صرف اپنے ذاتی تصورات پر بھروسہ کرلیا۔

اس سلسلے میں خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک خارجی کو مامون کے پاس لایا گیا، اس سے مامون نے کہا کہ تم نے ہماری مخالفت کیوں کی؟ اس نے جواب دیا کہ قرآن کریم کی آیت کی وجہ سے، مامون نے اس سے پوچھا: کیا تم کو اس بات کا یقین ہے کہ یہ وحی ہے؟ اس نے جواب دیا ہاں! یقین ہے، مامون نے پوچھا: اس پر کیا دلیل ہے؟ اس نے کہا: اجماع امت ہے۔ مامون نے کہا کہ جب قرآن کے اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ ہونے کے سلسلے میں اجماع کو مانتے ہو تو پھر آیت کریمہ کی تاویل کے سلسلے میں جو ان کا اجماع ہے اس کو کیوں نہیں مانتے۔ (جلد: ۱۰، ص: ۱۸۶)

ان خوارج نے ہمیشہ عام مسلمانوں پر کفر و شرک کی تہمت لگائی جب کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت کو شرک کے خوف سے مامون قرار دیا ہے۔ (بخاری، باب غزوۃ احد، حدیث: ۴۰۴۲)

اس گفتگو سے واضح ہو گیا کہ فہم قرآن میں ان لوگوں کی عقلیں انحراف و ضلالت کا شکار ہو گئیں اور اس کی وجہ یہ رہی کہ انہوں نے فہم وحی کے سلسلے میں اسلاف کرام کے منہج کی پیروی نہیں کی۔

تکفیری گروہ کی پہچان اور حدیث رسول اللہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس تکفیری منہج سے اپنی امت کو ڈرایا ہے، چنانچہ حضرت حذیفہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إن ما أتخوف عليكم رجل قرأ القرآن حتى رئيت بهجته عليه وكان ردئا للاسلام، غيّره إلى ما شاء الله، فانسلخ منه و نبذه وراء ظهره، و سعى على جاره بالسيف ورماه بالشرك، قال: قلت يا نبي الله! أيهما أولى بالشرك المرمي او الرامي قال بل الرامي. (صحیح ابن حبان، ابن کثیر نے فرمایا کہ اس کی سند جید ہے۔)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھے سب سے زیادہ اس شخص سے خوف ہے جو قرآن پڑھنے والا ہوگا، اس پر قرآن کا نور بھی نظر آئے گا، اسلام کا حامی اور اس کا دفاع کرنے والا ہوگا، مگر وہ قرآن کو بدل دے گا۔ ایسا کر کے وہ قرآن سے جدا ہوجائے گا اور اسے پس پشت ڈال دے گا، اپنے پڑوسی پر تلوار اٹھائے گا اور اس پر شرک کی تہمت لگائے گا۔ حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ان دونوں میں شرک سے کون زیادہ قریب ہوگا، شرک کی تہمت جس پر لگائی گئی ہے وہ یا جس نے تہمت لگائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، بلکہ تہمت لگانے والا۔

اس حدیث کی روشنی میں تکفیری متشدد گروہ کی درج ذیل علامتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) یہ گروہ قرآن سے گہرا تعلق رکھنے والا اور اس کی خدمت کرنے والا ہوگا اور اس کی وجہ سے لوگوں کو ان سے حسن ظن ہوگا۔

(۲) اس کو قرآن کی نورانیت سے کچھ حصہ بھی حاصل ہوگا، اس کی وجہ سے لوگوں کو اور زیادہ ان سے خوش گمانی ہوگی۔

(۳) دین کے لیے جوش وجذبہ رکھنے والا، اس کی حمایت اور دفاع کرنے والا ہوگا۔

(۴) ان سب کے باوجود وہ قرآن کے متوارث معانی سے منحرف ہو کر باطل تاویل کرے گا، کیوں کہ وہ طرق استنباط سے ناواقف ہوگا۔

(۵) چنانچہ وہ اپنے پڑوسی کو کافر ومشرک قرار دے گا۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرے گا بلکہ وہ اس کے خلاف ہتھیار اٹھائے گا اور خوں ریزی کرے گا۔

بدعملی کی بنا پر تکفیر نہیں!

ایسا دینی جوش جس میں بدعملی کی بنا پر تکفیر کی جائے، خصوصاً امراو حکام کے خلاف ہتھیار اٹھالیا جائے، یہ درست نہیں ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

کچھ ایسے امراو حکام ہوں گے تم ان کو پہچان جاؤ گے اور ان پر انکار کرو گے، جو ان کو پہچان لے وہ بری ہے اور جو ان پر انکار کرے وہ سلامتی میں ہے سوائے اس شخص کے جو ان سے راضی ہو اور ان کی پیروی کرے، صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم ان سے قتال نہیں کریں گے؟ آپ نے فرمایا کہ جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں گے، ان سے قتال نہیں کریں گے۔ (مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب الانکار علی الامراء)

اس کے علاوہ امام باقلانی، ابن حزم، ابوالفتح قشیری، غزالی، ابن وزیر یمنی اور جمہور علمائے اسلام کا مذہب یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے تکفیر سے گریز کیا جائے اور جب تک اجماع نہ ہو جائے اس وقت تک تکفیر نہ کی جائے۔

۲- جاہلیت کا مفہوم

متشدد جماعتوں کا نظریہ ہے کہ موجودہ مسلم معاشرہ بھی عہد نبوی سے قبل والا جاہلی معاشرہ ہے اور اس معاشرے کے خاتمے اور نئے اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے موجودہ جاہلی معاشرے اور ایسی حکومتوں سے ٹکر لینا، ان کے خلاف بغاوت کرنا اور ہتھیار اٹھانا ناگزیر ہے۔

موجودہ دور کی تکفیری جماعتوں تک یہ نظریہ بھی سید قطب کے ذریعے پہنچا ہے۔ انھوں نے اس نظریے پر بڑا زور دیا ہے اور اس کو اتنا دہرایا ہے کہ ان کی کتاب ''فی ظلال القرآن'' میں یہ لفظ ۱۷۴۰ مرتبہ آیا ہے۔

دراصل جاہلیت کے مفہوم کو سمجھنے میں سید قطب نے سخت ٹھوکر کھائی ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے یہ اعتقاد کہ اللہ تعالیٰ ہی بندوں کا حاکم ہے اور اسی کا حکم نافذ ہونا چاہیے اور پھر عملی طور پر اس کے نفاذ اور اس میں ہونے والی عملی کوتاہی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی اور نفاذ احکام کی کوتاہی کو عقیدے کا مسئلہ بنا کر ایسے لوگوں کی تکفیر کر دی جب کہ اجرائے احکام کے لیے کچھ اسباب، شروط اور موانع ہیں جن کی بنا پر احکام کا نفاذ متاثر ہو سکتا ہے۔

اس طرح وہ اصول ایمان میں فروع کو داخل کر کے خوارج کی ڈگر پر چل پڑے، جنہوں نے عمل کو ایمان کا جز قرار دے دیا، اسے عقیدے کا مرتبہ عطا کر دیا اور پھر گناہوں کی بنا پر لوگوں کی تکفیر کی۔

سید قطب کے اس خارجی منہج کی بنا پر بہت سے غلط مفاہیم سامنے آئے:

الف۔عقائد وفروع میں اختلاط

فی ظلال القرآن میں انھوں نے ایک مقام پر لکھا کہ عقیدے کا دائرہ زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے، حاکمیت کا مسئلہ اپنے تمام فروع کے ساتھ عقیدے کا مسئلہ ہے، یوں ہی اخلاق کا تعلق بھی عقیدے سے ہے۔ (جلد: ۴،ص: ۲۱۱۴، دار الشروق، قاہرہ، ۱۴۳۴ھ)

ب۔اصول دین میں اضافہ

فی ظلال القرآن میں انھوں نے اس بات کو بار بار دہرایا ہے کہ فقہ وعمل کا تعلق بھی عقیدے سے ہے۔عمل کے ہر شعبے کا تعلق عقیدے سے ایسے ہی ہے جیسے خود اصول کا عقائد سے ہے اور ان میں کسی سے بھی انحراف درحقیقت دین سے انحراف ہے بلکہ ایسے لوگ بت پرستوں کے برابر ہیں۔(دیکھیے: جلد: ۳ر کے مختلف مقامات)

ج۔جاہلیت کا نظریہ

سید قطب کے نزدیک زمانہ جاہلیت کوئی گزرا ہوا زمانہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک منہج حیات ہے جو قبل اسلام سے تاہنوز جاری ہے، اس کا ماحصل یہ ہے کہ آج مسلمانان عالم اسلام کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی جاہلیت اولیٰ جس میں کفر وشرک سب شامل ہے، کی طرف پلٹ چکے ہیں، جب کہ عام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اہل اسلام کبھی بھی کفر کی طرف نہیں پلٹیں گے اور ان کے طرز وعمل میں جو شریعت کی مخالفت پائی جاتی ہے اس کا تعلق معصیت وگناہ سے ہے کفر وارتداد سے نہیں ہے۔اس کے برخلاف سید قطب کا یہ موقف ہے کہ ملت اسلامیہ کفر وشرک اور زمانۂ جاہلیت کی طرف پلٹ چکی ہے، فی ظلال القرآن میں انہوں نے اس نظریے کا بار بار اعادہ کیا ہے۔ان کے اس نظریے کا حاصل یہ ہے کہ دنیا سے دین اسلام ختم ہو چکا ہے اور اللہ کی روئے زمین پر صرف شرک وکفر پھیلا ہوا ہے، اس بات کا ذکر بھی انھوں نے **فی ظلال القرآن** میں متعدد مقامات پر کیا ہے۔(جلد: ۲،ص: ۹۰۴-۹۹۰، اور متعدد مقامات)

د- دین ختم ہو چکا

جاہلیت کا غلط مفہوم و معنی سمجھنے کی وجہ سے وہ اس نتیجے تک پہنچے کہ روئے زمین پر دین اسلام نام کی کوئی شے باقی نہیں ہے، پوری امت مرتد ہو چکی ہے- انھوں نے اپنی کتاب **فی ظلال القرآن، العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام اور معالم فی الطریق** میں اس کی صراحت کی ہے-

ھ- دنیا سے ٹکراؤ ناگزیر

چوں کہ سید قطب یہ نظریہ قائم کر چکے تھے کہ امت اسلامیہ مرتد ہو چکی ہے تو اس سے انھوں نے ایک دوسرا نظریہ بنا لیا کہ پوری دنیا کے لوگوں سے ٹکراؤ ناگزیر ہے کیوں کہ ہر طرف جاہلی لیڈر شپ کا دور دورہ ہے، اس کو کسی بھی طور پر قبول کرنا شرک ہے، لہٰذا اللہ واحد کی ربوبیت و حاکمیت کے اعلان اور اس کے قیام کی جدو جہد کے لیے دنیا والوں سے ٹکراؤ ضروری ہے- (جلد:۲،ص:۱۰۶۱)

و- کافروں سے رواداری اور مسلمانوں سے قتال

بڑے تعجب کی بات ہے کہ سید قطب اختلاف ادیان رکھنے والوں سے تو عفو و درگذر کی بات کرتے ہیں، لیکن مسلمانوں سے رواداری کو درست نہیں سمجھتے کیوں کہ یہ مرتد ہیں اور مرتد کافر سے بھی بُرا ہے- (جلد:۲،ص:۲۰۳۷)

یہی نظریہ داعش تک پہنچتے پہنچتے یہاں تک پہنچ گیا کہ کافر ہو یا مومن سب کی گردن مارنا ضروری ہے-

۳- دارالکفر اور دارالاسلام کا مفہوم

قدیم مسلم فقہا نے احکام شرعیہ کے اجرا اور اس کے استثنائی احکام کے لحاظ سے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا: (۱) دارالاسلام (۲) دارالکفر -

اس تقسیم کا مقصد یہ تھا کہ ایک مسلمان مختلف علاقوں کا سفر کرے گا تو کن احوال میں اس پر عمومی احکام جاری ہوں گے اور کن احوال میں استثنائی احکام نافذ ہوں گے، اس کا فیصلہ کیا جا سکے- غیر مسلم علاقوں میں خرید و فروخت، نکاح و میراث کے احکام کیا ہوں گے، اس کو متعین کیا جا سکے، اس تقسیم کا مطلوب یہ تھا کہ مختلف احوال میں زندگی کیسے گزاری جائے

اس کے احکام کو تلاش کیا جا سکے، اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ دنیا کے ایک خطے کو دارالکفر کہہ کر ان سے جنگ وقتال اور خون ریزی کا بازار گرم کیا جائے، لیکن بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ اس مسئلے کو مثبت پہلو سے جدا کر کے ایک منفی پہلو دے دیا گیا اور اس کی بنا پر یہ مسئلہ دنیا میں مسلمانوں اور انسانوں کی تباہی و بربادی کا ذریعہ بن گیا اور لوگ مسلم فقہا اور خود مسلمانوں سے بدگمان ہو گئے۔ سید قطب اور ان سے متاثر افراد مثلاً صالح سریہ، شکری مصطفی، محمد عبدالسلام فرج اور پھر داعش کے نزدیک یہ ایک خون ریز فکر بن کر رہ گئی۔

سید قطب اپنی کتاب فی ظلال القرآن میں لکھتے ہیں کہ اسلام کی نظر میں دنیا کی دو قسمیں ہیں۔ پہلا دارالاسلام اور دوسرا دارالحرب، تیسری کوئی قسم نہیں۔ دارالاسلام سے مراد وہ ملک اور وہ علاقہ ہے جہاں اسلامی احکام نافذ ہوں خواہ وہاں کے باشندے سارے مسلمان ہوں یا کچھ مسلمان اور کچھ ذمی، یا سب ذمی ہوں لیکن حکام مسلمان ہوں جنھوں نے وہاں شرعی احکام نافذ کر رکھا ہو، گویا دارالاسلام ہونے کا دارومدار احکام شریعت کے نفاذ پر ہے۔

دارالحرب سے مراد وہ تمام ممالک اور علاقے ہیں جہاں اسلامی احکام نافذ نہ ہوں خواہ وہاں کے باشندے مسلمان ہوں یا کتابی یا کافر، گویا ہر وہ علاقہ دارالحرب ہے جہاں اسلامی احکام نافذ نہیں، اگرچہ وہاں کے حکام وعوام مسلمان ہوں، چنانچہ جہاں اسلامی احکام نافذ ہوں گے وہاں کے لوگوں کا جان و مال محفوظ ہوگا لیکن جہاں ایسا نہیں ہوگا اُن کے جان و مال مباح ہوں گے، ان کے جان و مال کی اسلام کی نظر میں کوئی قیمت نہیں ہوگی، وہ احکام شریعت کو نافذ کرنے والے حاکم سے صلح و معاہدہ کریں ورنہ ان سے قتال کیا جائے گا۔ (فی ظلال القرآن/ ۲/ ۸۷۴)

گویا سید قطب کے نزدیک دنیا کی تیسری کوئی حالت نہیں ہے، جس میں احکام شرعیہ کے عدم نفاذ کے باوجود ان سے جنگ وقتال کی صورت حال نہ پیدا ہو، بلکہ انسانی بنیادوں پر ایک معاہدے کے تحت امن وشانتی کی زندگی گزاری جائے، یوں ہی ان کی اس گفتگو سے اور ماسبق میں مذکور نظریات سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ موجودہ عہد کے عام مسلم ممالک ان کے نزدیک دارالکفر میں شامل ہیں، کیوں کہ جمہوری نظام قائم کر کے اور

اسلامی احکام کو پس پشت ڈال کر وہ سب مرتد ہو گئے اور ان سب کا حکم زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کا ہے۔ دارالاسلام اور دارالکفر کا یہ مفہوم جس میں مسلم ممالک اور خود مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی نوبت آجائے احادیث رسول کے خلاف ہے، فرمان نبوی ہے:

ومن خرج علی أمتی یضرب برھا وفاجرھا ولا یتحاشی من مومنھا ولا یفی لذی عھد عھدہ فلیس منی ولست منه.

(مسلم، کتاب الامارۃ، باب الامر بلزوم الجماعۃ ...)

جو شخص میری امت کے خلاف کھڑا ہو کر ہر نیک و بد کی گردن زنی میں لگ جائے، مومنوں کو قتل کرنے سے گریز نہ کرے اور کسی معاہد کا عہد نہ پورا کرے تو نہ اس کا مجھ سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی میرا اس سے کوئی تعلق ہے۔

سید قطب کی اس فکر میں اور ہمارے اسلاف کے بتائے ہوئے اس مفہوم میں جس سے اسلام کے رأفت و رحمت کا پہلو سامنے آتا ہے اور جو فکر مقاصد شریعت پر مبنی ہے، دونوں میں ذرا سی بھی ہم آہنگی نہیں ہے۔

فقہائے اسلام کی جانب سے پیش کی گئی دارالاسلام اور دارالکفر کی تعبیر کی حیثیت اُس زمانے کے لحاظ سے وہی ہے جو آج بین الاقوامی تعلقات کے قوانین کی ہے اور جس کے نتیجے میں آج انٹرنیشنل لا سامنے آیا ہے۔

امام محمد شیبانی کی کتاب السیر الکبیر کے مطالعے سے یہ تأثر ملتا ہے کہ یہ کتاب بین الاقوامی تعلقات کے اصول وضوابط کو بیان کرنے والی قانون کی پہلی کتاب ہے۔ قدیم فقہا سے استفادہ کرتے ہوئے اور دارالکفر اور دارالاسلام کی اصطلاح سے ان فقہا کی مراد کی گہرائی تک پہنچنے کے بعد **المعھد العالمی للفکر الاسلامی** نے ایک انسائیکلو پیڈیا شائع کیا ہے، جسے **موسوعۃ العلاقات الدولیۃ فی الاسلام** کا نام دیا گیا ہے اور اس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ آج دارالاسلام اور دارالکفر کی اصطلاح میں ایک تکملے کی حاجت ہے اور ان دونوں اصطلاحوں کے علاوہ ایک اور اصطلاح **دارالعھد** کے اضافے کی ضرورت ہے تاکہ دین اسلام کی آفاقیت و وسعت واضح ہو، لوگوں کو محاسن اسلام کا ادراک ہو اور ہدایت واخلاق عام ہو۔

شیخ ابن تیمیہ کا ایک فتویٰ اور اس کا غلط استعمال

شیخ ابن تیمیہ نے اپنے عہد میں اس امکان پر غور وفکر کیا کہ دارالکفر اور دارالاسلام کی اصطلاح سے ہٹ کر ایک ایسے دار کا بھی امکان موجود ہے جسے دارالاختلاط یا دارالاشتباہ کا نام دیا جائے اور جس پر نہ دارالاسلام کی تعریف صادق آتی ہو اور نہ دارالحرب کی۔ مثلاً کوئی ایسا علاقہ ہو جہاں لوگ مسلمان ہوں لیکن حاکم غیر مسلم ہو مثلاً تاتاری حکومت جو ملک شام پر مسلط ہو گئی تھی۔ اس فتوے میں ایسے ممالک یا علاقے کے بارے میں یہ کہا گیا کہ:

يعامل فيها المسلم بما يستحقّه ويقاتل فيها الخارج عن الشريعة بما يستحقه.

ایسے ممالک میں مسلمانوں سے ان کے استحقاق کے مطابق معاملہ کیا جائے گا اور شریعت سے خارج لوگوں کے ساتھ قتال کیا جائے گا جس کے وہ مستحق ہیں۔

محمد عبد السلام فرج نے اپنی کتاب **الفریضة الغائبة** میں اپنے اسی تکفیری دہشت گردانہ موقف کا اظہار کیا، اور پھر شیخ عطیہ صقر مصری نے اس کا عالمانہ رد لکھا، بعد میں علمائے زمانہ خود اس فتوی کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے اس فتوے کی اصل تلاش کرنے میں لگ گئے۔ تحقیق کے بعد پتا چلا کہ ابن مفلح جو مذہب حنبلی کے معتبر وثقہ ناقل ہیں، انھوں نے بھی اس فتویٰ کو نقل کیا ہے لیکن اس میں کلمہ ''یقاتل'' (قتال کیا جائے گا) کے بجائے ''یعامل'' (معاملہ کیا جائے گا) ہے اور ظاہر ہے کہ دونوں کے مفہوم میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

یہ فتوی مجلہ المنار میں بھی کلمہ ''یعامل'' کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ دراصل یہ تحریف پہلی بار ۱۳۲۷ھ میں فتاوی ابن تیمیہ کی پہلی طباعت میں ہوئی جس کے محقق فرج اللہ کردی تھے، پھر عبد الرحمن القاسم نے بھی اسی طباعت کی تقلید کی اور پھر یہی فتوی مشہور ومتداول ہوا اور اسی نسخے کے انگریزی اور فرانسیسی زبان میں ترجمے بھی ہوئے۔

اس کے بعد شیخ عبد اللہ بن بیہ نے مکتبہ ظاہریہ دمشق میں موجود اس فتوے کے مخطوطے تک رسائی حاصل کی اور تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہاں بھی ''یقاتل'' کے بجائے اصل لفظ ''یعامل'' ہی ہے اور اس طرح تحریف کاروں کی تحریف کا پردہ فاش ہوا۔

۴۔ ربانی فتح ونصرت صرف جہادیوں کے لیے

مسئلۂ حاکمیت کی بنا پر پوری سوسائٹی کو کافر ومشرک اور ان کو جاہلی قرار دینے سے ایک اور عجیب وغریب نظریہ سامنے آیا کہ سب لوگ کافر ہیں، صرف یہ جہادی گروہ ہی مومن ہے اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی فتح ونصرت اور روئے زمین پر غلبہ وقدرت عطا کرنے کی بات کی ہے ان کا تعلق صرف ان جہادیوں سے ہے جو کہ مومن ہیں۔

اس نظریے کی بنا پر ان کے اندر اور سرکشی پیدا ہوگئی اور پھر اس کے نتیجے میں انھوں نے پورے زور وشور کے ساتھ پوری انسانیت خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم، سب کے خلاف ظلم و ستم میں مصروف ہو گئے۔ شریعت اور اس کے مقاصد سے پوری طرح دور ہو گئے اور اس کو جہاد فی سبیل اللہ کا نام دے دیا گیا۔ سید قطب نے اس نظریے کا اعادہ بار بار فی ظلال القرآن میں کیا ہے۔ (جلد:۱،ص:۲۵۲،اور متعدد مقامات)

۵۔ جہاد کا مفہوم

دہشت پسند جماعتوں کے نزدیک جہاد کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا کے لوگ چوں کہ غیر اللہ کی حاکمیت قبول کر چکے ہیں، مسلمان بھی پھر سے زمانہ جاہلیت کی جانب پلٹ چکے ہیں، اس طرح لوگ کفر وشرک کے مرتکب ہو گئے ہیں اور ایک طویل زمانے سے دنیا میں دین مٹ چکا ہے، ہر طرف کفری قوانین اور مشرکانہ دساتیر رائج ہیں، اس لیے ان تحریکوں نے مسلم حکام کی معزولی پھر ان کے اور مسلمانوں کے بے رحمانہ کشت وخون کا سلسلہ شروع کیا اور اپنا ٹارگیٹ صرف یہ بنالیا کہ کسی بھی طرح جہاں بھی ممکن ہو حکومت کی کمان چھینی جائے اور متبادل سیاسی ڈھانچہ تیار کیا جائے، کیوں کہ دنیا کے لوگوں سے ٹکراؤ ضروری ہو گیا ہے۔ اسی فساد کو انھوں نے جہاد کا نام دے رکھا ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ جہاد کا مفہوم صرف جنگ وقتال میں محدود نہیں بلکہ درحقیقت اسلام میں جہاد ایک وسیع تر عمل ہے، جس کے مختلف مراحل اور اعلیٰ انسانی مقاصد ہیں۔ قتال تو جہاد کی صرف ایک صورت ہے اور اس قتال کا بھی مقصد یہ ہے کہ جرائم پسند اور فسادی عناصر کو ختم کر کے امن وشانتی کو لوگوں کے مابین عام کیا جائے، ہدایت ربانی سے لوگوں کو آشنا کیا جائے اور لوگوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب زندگی سے ہم کنار کیا جائے۔

پھر یہ جہاد بھی کسی حاکم کے زیر نگرانی اور کسی حکومت کی ماتحتی میں انجام پائے گا، جس میں جہاد کرنے والوں پر یہ واجب ہوگا کہ وہ کسی درخت کو نہ کاٹیں، کسی بکری کو نہ ماریں، کسی مذہبی پیشوا کو خوف زدہ نہ کریں، وغیرہ، پھر اس جہاد کے بھی کچھ حدود و قوانین ہیں، اگر ان حدود و شروط کی رعایت نہیں ہوگی تو پھر یہ جہاد نہیں رہ جائے گا بلکہ ناانصافی، ظلم اور سرکشی میں تبدیل ہو جائے گا۔

جہاد کی دہشت گردانہ تعبیر کا ذکر بھی سید قطب اور ان کے ہم نواؤں کے یہاں کھلے لفظوں میں ملتا ہے، صالح سریہ نے اپنی کتاب ''الایمان'' میں اپنے مزعومہ جہاد کو فرض عین قرار دیا ہے۔ گویا جہاد کے مفہوم کے حوالے سے دنیا ایسے دوراہے پر کھڑی ہے جہاں ایک طرف تو جہاد کا متوارث اور وسیع شرعی مفہوم ہے اور دوسری طرف دہشت پسند تحریکوں کا اختراعی پُر تشدد مفہوم ہے۔ درج ذیل سطور میں ان دونوں مفاہیم کا فرق سمجھیں:

(۱) علمائے امت کے مطابق جہاد کا مفہوم وسیع ہے یہ ایک عمدہ اور پُرنور عمل ہے جس کی متعدد صورتیں ہیں، چنانچہ جہاد قلب سے بھی ہوتا ہے، دعوت دین، علمی دلائل، بیان و توضیح اور فکر و تدبیر کے ذریعے بھی جہاد ہوتا ہے، البتہ! کبھی ایسی ایمرجنسی کی صورت حال ہوتی ہے کہ جب شر و فساد کے خاتمے کے لیے قتال اور جنگ ناگزیر ہوتی ہے۔ لیکن دہشت پسندوں کے نزدیک جہاد کا مفہوم قتال میں محدود ہے۔

(۲) اہل حق کے نزدیک جہاد ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے مقصود لذاتہ نہیں اور شریعت میں وسائل ان اعمال کو کہا جاتا ہے جن کا مقصود دوسرے کسی غرض کی تحصیل ہو، گویا جہاد کو ہمیشہ قتال سے جوڑ کر دیکھنا ضروری نہیں بلکہ اس سے مقصود ان اغراض کی تکمیل ہے جو قتال کے پس پشت ہیں۔ اسی وجہ سے کبھی کبھی مقاصد کی تحصیل کے لیے قتال نہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

اس کے برخلاف دہشت پسندوں کے نزدیک قتال مقصود لذاتہ ہے، چنانچہ علامہ قرضاوی نے ذکر کیا ہے کہ سید قطب نے جہاد کے حوالے سے سب سے تنگ اور پر تشدد رائے قائم کر رکھی ہے۔ وہ رائے بڑے بڑے فقہا و مبلغین کے موقف کے خلاف ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں (ان کے ماننے والوں) کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو پوری دنیا سے جنگ کرنے کے لیے تیار کریں۔ (ابن القریۃ والکتاب، جلد: ۳، ص: ۵۹)

۶۔تمکین فی الارض (supremacy over the earth) کا مفہوم

اخوان اوران سے نکلی ہوئی ہر تنظیم کی یہ بنیادی فکر ہے۔تمکین کا مفہوم ان کے نزدیک یہ ہے کہ روئے زمین کفر وارتداد کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی ہے،اس لیےان کے خلاف مسلح جدوجہد ضروری ہے، یوں ہی حکومت واقتدار پانے کے لیے مختلف قسم کی تدابیر،کوششوں اور اقدامات کی ضرورت ہےاوراقامت دین کا یہی واحدراستہ ہے۔حکومت واقتدار کے حصول کی انہی کوششوں کو وہ تمکین فی الارض کی کوشش سے تعبیر کرتے ہیں۔اس سلسلے میں ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالی نے حضرت یوسف علیہ السلام کی دعانقل کرتے ہوئے ارشادفرمایا: رَبِّ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ (یوسف: ۵۵) (اے مولیٰ! مجھے زمین کےخزانوں کا مالک بنادے، میں حفاظت کرنے والا اورعلم والا ہوں)

ان کے مطابق یہ آیت کریمہ بتاتی ہے کہ حکومت وامارت کےحصول اور قیام کی کوشش ہونی چاہیے۔سید قطب نے اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو کی ہےاور یہ بتایا ہے کہ دراصل حضرت یوسف علیہ السلام ایک جاہلی معاشرے میں زندگی گزار رہے تھے،اس لیے انھوں نے امارت وحکومت کی کوشش کی اور چوں کہ آج ہمارے زمانے میں بھی یہی صورت حال ہے اس لیے آج بھی ''تمکین فی الارض'' (غلبہ واقتدار) کے حصول کے لیے جدوجہد کی ضرورت ہے۔(فی ظلال القرآن، جلد: ۴،ص: ۲۰۱۳،العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام،ص: ۱۸۳)

ان کی یہ ساری گفتگو بڑی خطرناک ہے کیوں کہ اس گفتگو سے انھوں نے گویا یہ اعلان کردیا کہ اب دین منقطع ہو چکا ہے،احکام شریعت کا کہیں وجودنہیں رہ گیااور یہ امت کفروشرک کی علم بردار ہوگئی ہے جب کہ دین محمدی قیامت تک کے لیے ہے اور یہ دین قیامت تک بالکلیہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔یوں ہی یہ خیرامت ہے جوشر پر جمع نہیں ہوگی۔

دوسری بات یہ کہ مسلمانوں نے مکے میں تیرہ سال تک بالکلیہ مختلف ماحول میں زندگی گزاری، حبشہ میں الگ صورت حال سے نبرد آزما ہوئے اور مدینے میں مختلف ادوار میں الگ الگ حالات رہےتو کیا مغلوبیت واقلیت کے زمانے میں وہ دین پر قائم نہیں تھے؟حقیقت یہ ہے کہ انہی مختلف احوال سےتومسلمانوں کو یہ سبق ملتا ہے کہ کیسے مختلف احوال میں مسلم رہتے ہوئے اوردین وشریعت پرقائم رہتے ہوئے زندگی گزاری جائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ جاہلی زمانے میں تھے، یہ ان کے مقام نبوت پر دست درازی ہے، کیوں کہ زمانہ جاہلیت تو کفر وشرک سے بھرا وہ زمانہ ہوتا ہے جس میں کوئی نبی نہ ہو، اس زمانے میں تو وہ خود بطور نبی موجود تھے۔ یوں ہی حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ کہنا کہ انھوں نے امارت وحکومت کی طلب کی تو یہ سراسر غلط ہے اور قرآن کے سیاق وسباق اور اس زمانے کے حالات کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات پر علم کی صفت سے ذکر کیا ہے اور ہوا یہ کہ جب زراعت کی باریکیوں اور اقتصادی مسائل و بحران کے حل کے سلسلے میں حضرت یوسف علیہ السلام کے علم کا اظہار مصری قوم جو خود بھی علم زراعت میں بہت ماہر تھی، کے سامنے قحط سالی کے دوران ہوا تو یوسف علیہ السلام کے پاس بار بار قاصد بھیجا گیا، لیکن آپ نہیں آئے یہاں تک کہ بادشاہ نے خود درخواست کی کہ آپ وزیر یا اقتصادی مشیر بن جائیں تو آپ نے اس کے اصرار پر یہ منصب قبول کرلیا، یہاں آپ نے خود سے امارت وحکومت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ آپ کو بہ اصرار یہ ذمے داری سونپی گئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں ''تمکین'' یا اس کے مادے سے مشتق الفاظ مختلف مقامات پر مذکور ہیں، اور جن کو ''تمکین'' کی صفت حاصل ہوئی ان میں مسلم اور غیر مسلم دونوں تھے۔

تمکین سے تعلق رکھنے والی آیات اور خصوصاً سورۂ یوسف اور واقعہ ذوالقرنین سے تمکین کا جو مفہوم سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو جدید معاشرتی وثقافتی امور، تہذیب وتعمیر اور ماڈرن سائنسی علوم میں اتنا ترقی یافتہ بنائے کہ اس کی علمی تحقیقات سامنے آئیں جس کے نتیجے میں بے روزگاری ختم ہو، فقر ومفلسی کی شرح کم ہو، بے گھر اور بے سہارا مرد وعورت اور بچے نظر نہ آئیں، ہر طرف خوش حالی ہو اور انسانی سماج کی ترقی ہو۔ تمکین کا وہ معنی نہیں جو دہشت پسند تنظیموں نے سمجھا کہ پوری دنیا کو کافر ومشرک جان کر کسی بھی طرح ان سے زمام حکومت چھین لی جائے اور اس مقصد کے لیے جتنی بھی خون ریزیاں ہوں سب کو روا سمجھا جائے بلکہ اسے جہاد کا نام دے کر تقدس کا جامہ پہنا دیا جائے۔ یہ دین وشریعت پر ظلم اور قرآن کے معانی ومفاہیم میں تحریف ہے۔

۷۔وطن کا مفہوم

(۱) دہشت پسند تنظیموں کا وطن کے حوالے سے یہ نظریہ ہے کہ وطن صرف ایک مشت خاک ہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ وطن سے محبت کا جذبہ ایک بے وقعت انسانی جذبہ ہے جس کو دور کرنا ایسے ہی ضروری ہے جیسے گناہوں کی جانب میلانات کو، وطن اور اس سے محبت کی فکر جاہلی اور مردود ہے، کیوں کہ یہ خلافت اور امت کے نظریے کے خلاف ہے، وطن استعماری طاقتوں کے بنائے ہوئے جغرافیائی حدود کا نام ہے، اس لیے ہمیں اس سے کوئی محبت نہیں، وطن تو اس مقام کو کہتے ہیں جہاں انسان رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت کی ہے۔(فی ظلال القرآن، جلد: ۳،ص:۱۴۴۱)

(۲) حب الوطنی پر کوئی آیت یا حدیث رسول موجود نہیں ہے۔

(۳) جن احادیث میں مکہ مکرمہ سے حضور نے اپنی محبت کا اظہار فرمایا ہے یہ مکہ کی خصوصیت ہے دوسرے وطن کو اس پر ہم قیاس نہیں کریں گے۔ سید قطب نے فی ظلال القرآن میں متعدد مقامات پر وطن کے حوالے سے انہی مفاہیم کا اعادہ کیا ہے اور حب الوطنی کے تمام تصورات کو جاہلی قرار دیا ہے۔(دیکھئے: جلد: ۲،ص:۷۰۸)

یہ ساری باتیں جو سید قطب کی جانب سے کہی گئی ہیں اس سلسلے میں عرض ہے کہ وطن کا جو تصور سید قطب نے پیش کیا ہے وہ مخدوش تصور ہے، کیوں کہ وطن صرف ایک مشت خاک کا نام نہیں بلکہ وطن ایک قوم، تہذیب وتمدن، تاریخ، مسائل، سیاست، فکری رجحانات، تنظیمیں، جغرافیائی حدود اور اس میں پیدا ہونے والی عبقری شخصیات سے عبارت ہے۔

وطن کی جانب قلب کے میلان کو گناہوں سے تشبیہ دینا طیب وخبیث کو باہم خلط ملط کرنے کے مترادف ہے، کیوں کہ وطن کی محبت ہر قلب سلیم میں موجود ہوتی ہے، جب کہ گناہوں کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ وطنیت ایسی کوئی فکر نہیں جو خلافت وامت کے نظریے کے بالمقابل ہو، بلکہ دین سے پورا تعلق برقرار رکھتے ہوئے کسی جغرافیائی علاقے سے نسبت کو اسلام نے مذموم نہیں قرار دیا ہے، ہاں اگر یہ محبت دین وایمان پر غالب آجائے اور حق سے روک دے اور تعصب کا سبب بن جائے تب یہ مذموم ہے، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وطن مکہ مکرمہ کی جانب اپنے اشتیاق کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔

وطن کی تعبیر انسان کی پسندیدہ جائے سکونت سے کرنا اور پھر یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت کی ہے، یہ درست نہیں ہے، کیوں کہ آیت کریمہ وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا.(توبہ: ۲۴) میں رہائشی مکانات مراد ہیں اوران سے ذاتی عیش وعشرت کی طرف اشارہ ہے، مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور جہاد فی سبیل اللہ یعنی خیر وسعادت کی نشر واشاعت اور سماجی فلاح و بہبود کی محبت ذاتی فلاح و بہبود پر غالب نہیں آنی چاہیے۔

حب الوطنی کے اشارات قرآن کریم اور مفسرین کے کلام میں موجود ہیں ،امام رازی، ملاعلی قاری اور دوسرے بے شمار علما ومفسرین کے یہاں اس کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، یوں ہی احادیث نبویہ اور شارحین کے کلام میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ آپ جب سفر سے لوٹتے تو مدینہ کے در و دیوار کو بغور دیکھتے ،اس حدیث کی شرح میں امام عسقلانی اور عینی وغیرہ نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے حب الوطنی کی مشروعیت کا پتہ چلتا ہے،ان کے علاوہ دوسرے بہت سے محدثین وشارحین نے ایسی روایات اور مفاہیم ذکر کیے ہیں جن سے حب الوطنی کا درست ہونا معلوم ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ فقہا، اولیا ،حکما ،شعرا ،ادبا،سب کے یہاں حب الوطنی کے جذبات کا اظہار ملتا ہے، یوں ہی حب الوطنی کے موضوع پر بہت سے علما نے کتابیں بھی لکھیں ہیں جاحظ نے حب الوطن نامی کتاب لکھی ،یوں ہی ابو حاتم سجستانی ،سمعانی ،ابوحیان توحیدی وغیرہم کی بالترتیب ''الشوق الی الاوطان''، ''النزوع الی الاوطان'' اور ''الحنین الی الاوطان'' نامی کتابیں ہیں۔

۸۔غلبۂ اسلام کا تصور

بعض لوگوں نے اسلامی غلبے کے پروجیکٹ کے حوالے سے بڑا واویلا مچا رکھا ہے، جو اس کی حمایت کرتا ہے اس کو اللہ اور اس کے دین کا حامی سمجھا جاتا ہے اور جو اس کی مخالفت کرتا ہے اسے اللہ اور اس کے رسول کا دشمن قرار دیا جاتا ہے،لیکن کوئی بھی اس اسلامی پروجیکٹ کی حقیقت کو لوگوں کے سامنے پیش نہیں کرتا تا کہ اس کے تعلق سے وہ اپنی صحیح رائے قائم کرسکیں ،خدمت دین متین میں ازہر کی ہزار سالہ تاریخ کی روشنی میں اسلامی غلبے کے پروگرام کے اہم خصائص یہ ہونے چاہیے:

(۱)اسلامی پروگرام میں موجودہ عہد کے ڈپلومیٹک، ادارتی، سیاسی، اقتصادی، سماجی،فلسفیانہ اور سائنسی سوالات ومشکلات کا تفصیلی اور جزئی جواب موجود ہو۔

(۲)اس جواب کا ماخذ نصوص شرع،اس کے مقاصد،اجماعات،احکام وتشریعات، اخلاق واقدار،اصولی وفقہی قواعد،سنن الٰہیہ اوراس کے آداب وفنون ہوں۔

(۳)اس کی صورت یہ ہو کہ پہلے علوم ومناہج اور ان سے ثابت فروعات کو وجود میں لایا جائے،پھران کی روشنی میں ایسے عملی پروگرام ہوں جو تعمیری ادارے کی شکل میں تبدیل ہوجائیں۔

(۴)اس اسلامی پروجیکٹ کا مقصود یہ ہو کہ علوم ومعارف اور خدمات کے ایسے عملی ادارے قائم ہوں،جن میں مقاصد شریعت کی روح دوڑ رہی ہو،جن کے ذریعے جان، عقل،عزت،دین،مال اوراحترام انسانیت کے اقدار کی حفاظت اوراخلاقی اساس کی تعظیم ہو،عالمی افادے اوراستفادے کے لیے دروازے کھلے ہوں،جس کے ذریعے بچوں اور عورتوں کی اہمیت وقیمت واضح ہواور ماحولیات،انسان وحیوان،نباتات وجمادات کی حفاظت ہو۔بہرصورت انسان کا تعلق اپنے خالق ومالک سے مضبوط ہو،تہذیب ایسی ہو جس میں مسلم،عیسائی،یہودی،بدھشٹ،کمیونسٹ،سیکولر،لیبرل،دایاں محاذ،بایاں محاذ،ملحد وبے دین اورسارے مذاہب کے لیے وسعت ہو۔اس میں کسی کواس کے معاملات میں مجبور نہ کیا جائے بلکہ سب کے ساتھ رحمت ورافت اورعدل وانصاف کا مظاہرہ ہو۔

(۵)اسلامی پروگرام کا محور ومقصد اخلاق،اخلاقی اقدار،احترام انسانیت اوردنیا اور آخرت میں لوگوں کوسعادت مندی سے بہرہ مند کرنا ہو۔

ان مقاصد سے ہٹ کر جو بھی اسلامی پروگرام ترتیب دیا جائے گا وہ باطل وبے معنی ہوگا،لیکن اس طرح کے پروگرام تیار کرنا عام آدمی کا کام نہیں ہے بلکہ یہ مجتہدین،فقہائے شریعت اور ماہرین دین کی ایک ٹیم کا کام ہے۔

ان باتوں کو سامنے رکھے بغیر دہشت پسند تنظیموں کی جانب سے آج جس اسلامی پروگرام کا پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے،جس میں تکفیر وتشریک،تہمت،قتل وغارت گری،انسانی اقدار کی پامالی اورمقاصد وآداب شریعت کی بے حرمتی کے علاوہ کچھ بھی نہیں،اس کی کوئی حیثیت نہیں اوراس کے ذریعے تو لوگ اسلام سے بدگمان ہوکر اسلام سے دور ہی ہورہے ہیں۔

دہشت پسندوں کے فکری نقائص کی بنیادیں!

کسی بھی مسئلے پر تفکر وتدبر اور قرآن وسنت سے استفادے کے لیے درج ذیل مراحل سے گزرنا ضروری ہے اور ان ہی مراحل سے نہ گزرنے کی بنا پر یہ تحریکات غلط افکار کے دلدل میں پھنس گئیں۔فکری استنباط کا جن علمی مراحل سے گزرنا ضروری ہے وہ درج ذیل ہیں:

(۱)استنباط کے وقت مسئلے سے تعلق رکھنے والی تمام آیات واحادیث پیش نظر ہوں، صرف فقہی آیات پر نظر نہ ہو بلکہ قصص ،اخبار سب پر نگاہ ہو ۔طوفی شرح مختصر الروضۃ (جلد: ۳،ص: ۵۷۷) میں کہتے ہیں کہ احکام شرع جس طرح اوامر ونواہی سے مستنبط ہوتے ہیں اسی طرح قصص ومواعظ سے بھی ان کا استخراج ہوتا ہے،قرآن کی شاید ہی کوئی آیت ہو جس سے کوئی حکم مستنبط نہ ہوتا ہو،اور استنباط بھی علما کے طبائع واذہان اور روحانی فتوحات کے اختلاف سے مختلف ہوا کرتے ہیں۔یوں ہی درجات استنباط بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔

(۲) شرعی نصوص کو صحیح طور پر سمجھ کر ایک دوسرے سے ربط جوڑا جائے تاکہ تقدیم وتاخیر، عام وخاص اور مطلق ومقید کے خصائص تک رسائی ہو سکے۔

(۳) دلالتوں کی مختلف جہات پر اچھی نظر، مدلولات کی صحیح معرفت ،عربی زبان کی وسعتوں سے مکمل آگہی اور علوم عربیہ کا کامل ادراک ہو ،تمام علمائے اصولیین نے ان مباحث کا ذکر اصول استنباط کے ذیل میں کیا ہے۔

(۵)استنباط کے وقت پہلے سے کوئی نظریہ نہ بنا ہوا ہو اور قرآن کو اپنے اس سابقہ نظریے کے اثبات کے لیے آلہ نہ بنایا جائے ، بلکہ قرآن جس نتیجے تک اصول استنباط کی روشنی میں لے جائے اس کو اختیار کیا جائے۔

(۵) قرآن اور نصوص شریعت سے ایسے مفاہیم نہ مستنبط کیے جائیں، جو مقاصد شرع سے مزاحم اور مسلمات دین سے متصادم ہوں۔

(۶) سابقہ اسلامی میراث کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے اور ان سے استفادہ کیا جائے۔

(۷)ان اصول ومناہج سے ہوشیار رہا جائے،جن کے بھنور میں سابقہ گمراہ جماعتیں پھنس چکی ہوں۔

ان کے علاوہ فکری استنباط کے وقت یہ باتیں بھی قابل توجہ ہیں:

(۱) معرفت وحی، اس کے مناہج فہم کا علم اور صورت حال کا صحیح ادراک، ان تینوں ارکان کے بغیر کبھی بھی صحیح فہم کی تشکیل نہیں ہو سکتی۔

(۲) وہ فکریں اور وہ استنباطات جو نفسیاتی اور جذباتی دباؤ کے تحت وجود میں آتے ہیں، ان میں عمیق تفکر اور صحیح مناہج کا فقدان ہوتا ہے، اس لیے حالت غضب میں فیصلے صادر کرنے کی احادیث کریمہ میں ممانعت آئی ہے۔

(۳) مصالح ومفاسد کے باب میں اجتہاد کا حق صرف اس شخص کو ہے جس کو تفصیلی طور پر مقاصد شرع کی معرفت ہو۔

(۴) مقاصد شریعت کی عدم معرفت اور نظام فطرت سے بے خبری سے فہم میں خلل واقع ہوتا ہے۔

فکری نقائص کے اثرات

بہت سی اسلامی اصطلاحوں کا صحیح مفہوم نہ سمجھ پانے کی وجہ سے پوری دنیا خصوصاً عالم اسلام، امت مسلمہ اور مذہب اسلام پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے، چنانچہ حاکمیت کا غلط مفہوم سمجھنے اور سمجھانے کا اثر یہ ہوا کہ دوسرے وہ تمام افکار سامنے آئے جن کا تذکرہ مسئلہ حاکمیت کے بعد کیا گیا ہے، یوں ہی سید قطب کی اس فکر سے تمام دہشت پسند تنظیمیں نکلیں، اخوان، القاعدہ، التکفیر والہجرۃ اور اس جیسی دوسری تنظیمیں سامنے آئیں جس کی انتہا موجودہ عہد میں داعش پر ہوئی۔ صالح سریہ، شکری مصطفیٰ، محمد عبد السلام فرج جیسے بے شمار افراد نکلے اور ان کے قلم سے اسی فکر کا نمائندہ لٹریچر بھی ظاہر ہوا۔

نظریہ جاہلیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری دنیا سے دین کو معدوم قرار دے کر شریعت اسلامیہ کے قیام کے نام پر کشت وخون کا بازار گرم کر دیا گیا، ہزاروں مسلمانوں کو قتل کیا گیا، مسلم حکام کے خلاف بغاوت کی گئی اور پوری دنیا کا عموماً اور مسلم دنیا کا خصوصاً امن وامان غارت کر دیا گیا۔ یہ نظریہ قائم کر کے کہ اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر مومنین کے غلبے کا جو وعدہ کیا ہے اس کے مستحق صرف یہی لوگ ہیں، سارے مسلمانوں کی تکفیر کر دی گئی اور ان سے زمام مملکت چھیننے کی کوشش شروع ہوگئی، جہاد کے مفہوم کو قتال میں منحصر کر کے احادیث و

قرآن کی تکذیب کی گئی، سارے علمائے شریعت کی مخالفت کی گئی اور پوری امت سے ہٹ کر ایسا نظریہ قائم کیا گیا جس سے انسانی جانوں کی پامالی اور ناقدری کی راہ ہموار ہوگئی اور نوجوانوں کا استحصال کر کے ان کے ذہن میں ہدایت ربانی، اخلاق نبوی، اسلامی عدل و انصاف اور رأفت و رحمت کی عظمت کو راسخ کرنے کے بجائے قتل و خون کا زہر گھول دیا گیا۔

نظریۂ تمکین کی آڑ میں جاہ و ریاست کی طلب اور حصول اقتدار کی راہ ہموار کی گئی۔ قرآنی آیات کا غلط معنی پیش کر کے تحریف کے جرم کا ارتکاب کیا گیا، وطن کی غلط تعبیر و تشریح کر کے ایک پاکیزہ انسانی جذبے کی ناقدری کی گئی بلکہ اس کو سراپا معصیت بنا دیا گیا، اس طرح انبیا، صحابہ اور ہزاروں ان علما کی بے عزتی کی گئی جن کے یہاں وطن کے حوالے سے محبت کے پاکیزہ احساسات پائے جاتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سید قطب کے عہد سے لے کر اب تک جتنی بھی دہشت پسند جماعتیں وجود میں آئی ہیں، سب کی فکری بنیادیں انہی بیان کردہ افکار و آرا پر ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ ان میں آپس میں کس قدر فکری مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔

خلاصہ نگار کے خیال میں مصنف کتاب نے بڑی گہرائی سے سید قطب اور ان کی کوکھ سے پیدا ہونے والی تمام تنظیموں اور ان کے افکار کا مطالعہ کیا ہے اور بہت سلیقے سے علمی انداز میں ان پر تنقید کی ہے۔

مصنف نے یوں تو اپنی کتاب میں عرب دنیا سے تعلق رکھنے والے دہشت پسند افراد، ان کے لٹریچر اور ان کی تنظیموں کا تجزیہ کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا تجزیہ برصغیر ہند و پاک اور دنیا بھر کی دہشت پسند تنظیموں پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے۔

اللہ کریم امت مسلمہ کو صراط مستقیم پر قائم فرمائے اور افراط و تفریط اور تشدد و ارہاب کی لعنت سے نکال کر ارشاد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کے فریضے پر مامور فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

کتابیات

القرآن الحکیم

تفسیر

البیان، جاوید احمد غامدی (پ: ۱۹۵۲ء)، المورد، لاہور، مئی ۲۰۱۰ء

التاويلات النجمية، نجم الدين كبرىٰ (۶۱۸ ھ)، دار الكتب العلمية، ۲۰۰۹ ھ

التفسير القرآني للقرآن، عبد الكريم الخطيب (بعد ١٣٩٠ هـ)، دار الفكر العربي، القاهرة

التفسير المظهرى، ثناء الله پانی پتی (۱۲۲۵)، مكتبة الرشدية، الباكستان، ١٤١٢هـ

الجامع لاحكام القرآن، القرطبي (۶۷۱ھ)، دار الكتب المصرية، القاهرة، ۱۹۶۴ء

الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۶۲ء)، مجلس برکات، مبارک پور، ۲۰۱۲ء

الكشاف عن حقائق التنزيل، الزمخشرى (۵۳۸ھ)، دار إحياء التراث العربي

الوسيط في تفسير القرآن المجيد، أبو الحسن الواحدي (٤٦٨هـ)، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة: الأولى، ١٤١٥هـ - ١٩٩٤م

أنوار التنزيل وأسرار التأويل، ناصر الدين البيضاوي (٦٨٥هـ)، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة: الأولى - ١٤١٨هـ

تفسير التستري، سهل الله التُستري (٢٨٣هـ)، دار الكتب العلمية، بيروت، ١٤٢٣هـ

تفسير القرآن العظيم، ابن كثير (٧٧٤هـ)، دار الكتب العلمية، بيروت، ١٤١٩هـ

تفسير المنار، محمد رشيد رضا (١٣٥٤هـ)، الهيئة المصرية العامة للكتاب، ١٩٩٠م

تفہیم القرآن، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹ء)، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء

جامع البیان في تأویل القرآن، ابن جریر طبري (۳۱۰ھ)، مؤسسة الرسالة، ۲۰۰۰م
روح المعاني، محمود آلوسی (۱۲۷۰ھ)، دار الکتب العلمیة، بیروت، ۱۴۱۵ھ
فی ظلال القرآن، سید قطب (۱۹۶۶م)، دار الشروق، القاھرة، ۱۴۳۴ھ
لطائف الإشارات، عبد الکریم القشیري (٤٦٥ھ)، الھیئة المصریة العامة للکتاب، مصر، ١٤٣١ھ
معالم التنزیل، ابن مسعود البغوي (٥١٠ھ) دار طیبة للنشر والتوزیع، ۱۴۱۷ھ
مفاتیح الغیب، فخر الرازي (۶۰۶ھ)، دار إحیاء التراث العربي، بیروت، ۱۴۲۰ھ

حدیث

الادب المفرد، محمد بن إسماعیل البخاري (٢٥٦ ھ)، مکتبة المعارف للنشر والتوزیع، الریاض، الطبعة: الأولی، ١٤١٩ھ-١٩٩٨م
السنن الکبریٰ، أبوبکر البیھقي (۴۵۸ھ)، دار الکتب العلمیة، بیروت، ۲۰۰۳ء
المستدرک، ابو عبداللہ الحاکم (۴۰۵ھ)، دار الکتب العلمیة، بیروت، ۱۹۹۰ء
المعجم الأوسط، أبو القاسم الطبراني (٣٦٠ھ)، المکتبة الشاملة
المُعْجَمُ الکَبِیر، أبو القاسم الطبراني (٣٦٠ھ)، المکتبة الشاملة
سنن ابن ماجه، ابو عبداللہ قزوینی (۲۳۷ھ)، دار الرسالة العالمیة، ۲۰۰۹ء
سنن ابی داؤد، ابوداؤد السِّجِسْتاني (۲۵۷ھ)، دار الرسالة العالمیة، ۲۰۰۹ء
سنن الترمذی، الترمذي (۲۷۹ھ)، مصطفی البابي الحلبي، مصر، ۱۹۷۵ء
سنن النسائی (٣٠٣ھ)، المکتبة التجاریة الکبری بالقاھرة، ١٩٣٠م
صحیح البخاری، محمد بن اسماعیل بخاری (۲۵۶ھ)، دار طوق النجاة، ۱۴۲۲ھ
صحیح مسلم بن الحجاج (۲۶۱ھ)، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۵۵ھ
صحیح ابن حبان (۳۵۴ھ)، موسسة الرسالة، بیروت، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء
کنز العمال، علي المتقي الھندي (٩٧٥ھ)، مؤسسة الرسالة، ١٤٠١ھ/١٩٨١م
مسند احمد، ابو عبداللہ احمد بن حنبل (۲۴۱ھ)، دار الحدیث، -القاہرة، ۱۹۹۵ء
مسند الفردوس، أبو شجاع الدیلميّ (٥٠٩ھ)، دار الکتب العلمیة، بیروت، ١٩٨٦م

شرح حدیث

احکام الاحکام، ابن دقیق العید (۷۰۲ھ)، مطبعۃ السنۃ المحمدیۃ، بدون تاریخ

اشعۃ اللمعات (اردو)، شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ)، اعتقاد پبلی شینگ ہاؤس، دہلی

اکمال المعلم شرح مسلم، قاضی عیاض مالکی (۵۴۴ھ)، دار الوفاء للطباعۃ والنشر والتوزیع، مصر، الطبعۃ: الأولی، ۱۴۱۹ھ-۱۹۹۸م

التمہید، ابن عبدالبر (۴۶۳ھ)، وزارۃ عموم الاوقاف، مغرب، ۱۳۸۷ھ

التوضیح لشرح الجامع الصحیح، سراج الدین ابن المُلقّن (۸۰۴ھ)، إدارۃ الشؤون الإسلامیۃ، قطر

المفہم لما أشکل من تلخیص کتاب مسلم، ابو العباس قرطبی (۶۵۶ھ)، ابن کثیر، دمشق ۱۹۹۶ء

المنہاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج، ابن شرف النووی (۶۷۶ھ)، دار حیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۹۲ھ

السیرۃ

الرحیق المختوم، مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری (۲۰۰۶ء)، المکتبۃ السلفیۃ، لاہور، ۲۰۰۲ء

السیرۃ النبویۃ، ابن ہشام (۲۱۸ھ)، مکتبۃ مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، ۱۹۵۵ء

تاریخ الرسل والملوك، ابن جریر الطبري (۳۱۰ھ)، دار المعارف، مصر، ۱۹۶۷م

زاد المعاد، ابن قیم الجوزیۃ (ت۷۵۱ھ)، الرسالۃ، بیروت، ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۴م

فقہ واصول

اشرف الہدایہ، مولانا جمیل احمد سکروڈھوی (۲۰۱۹ء)، دار الاشاعت، کراچی، ۲۰۰۵ء

البحر ائق شرح کنز الدقائق، ابن نجیم المصري (۹۷۰ھ)، دار الکتاب الإسلامي

المدخل الی دراسۃ المذاہب الفقہیۃ، علی جمعۃ (المولود: ۱۹۵۲ء)، دار السلام للطباعۃ والنشر، مصر، ۲۰۱۲ء

المغنی، موفق الدین بن قدامہ مقدسی حنبلی (۶۲۰ھ)، مکتبۃ القاہرۃ

الہدایۃ، علي المرغیناني (۵۹۳ھ)، دار احیاء التراث العربي، بیروت

بدائع الصنائع، علاء الدين الكاساني (٥٨٧ھ)، دار الكتب العلمية، ١٩٨٦ء
رد المحتار على الدر المختار، ابن عابدين (١٢٥٢ هـ)، شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي وأولاده بمصر، الطبعة: الثانية ١٣٨٦هـ/١٩٦٦م
شرح مختصر الروضة، سليمان الطوفي، (٧١٦هـ)، مؤسسة الرسالة، ١٤٠٧ھ
فتح القدير، ابن الهمام الحنفي (٨٦١ هـ)، شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي وأولاده بمصر، الطبعة: الأولى، ١٣٨٩هـ=١٩٧٠م
فقه السنة، سيد سابق (١٤٢٠هـ)، دار الكتاب العربي، بيروت، ١٣٩٧هـ - ١٩٧٧م
قواعد الأحكام في مصالح الأنام، عز الدين بن عبد السلام (٦٦٠هـ)، مكتبة الكليات الأزهرية، القاهرة، ١٤١٤هـ - ١٩٩١م
مجموع فتاویٰ العلامة عبد العزيز بن باز (١٤٢٠ هـ)، مكتبة الشاملة
نهاية المحتاج، شمس الدين الرملي (١٠٠٤هـ)، دار الفكر، بيروت، ١٤٠٤هـ/١٩٨٤م

تصوف

آداب المریدین، ابونجیب ضیاء الدین سہرودی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۲۰۰۵ء
اکیسویں صدی میں تصوف: عالمی بحران کے حل کی تلاش، علما و مشائخ بورڈ، دہلی، ۲۰۱۶ء
الرسالۃ المکیۃ، قطب الدین دمشقی (۷۸۰ھ)، أکادمیۃ شاہ صفی، اللہ آباد، ۲۰۱۴ء
عوارف المعارف، شہاب الدین سہروردی (۶۳۲ھ)، دار المعارف، مصر، ۲۰۰۰ء
فوائح الجمال و فواتح الجلال، الشیخ نجم الدین کبریٰ (۶۳۰ھ)، دار سعاد الصباح، کویت، ۱۹۹۳م
مجمع السلوک، مخطوطہ، شیخ سعد الدین خیر آبادی (۹۲۲ھ)، مخزونہ مکتبۃ الاحسان، الہ آباد

جہادیات

الجہاد فی الاسلام، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۷۹ء)، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور
القرآن و القتال، محمود شلتوت (۱۹۶۳ء)، دار الکتاب العربی، القاہرۃ، ۲۰۱۷ء
المحجۃ المؤتمنۃ فی الآیۃ الممتحنۃ، مشمولہ فتاویٰ رضویہ، جلد یازدہم، امام احمد رضا اکیڈمی، بریلی، ۲۰۱۶ء
امن عالم، مولانا وحید الدین خان، گڈ ورڈ بکس، نویڈا، انڈیا، اشاعت اول: ۲۰۰۴ء

تعبیر کی غلطی، مولانا وحید الدین خان (۲۰۲۱ء)، مکتبۃ الرسالہ، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء
جہاد اور روح جہاد، محمد عنایت اللہ اسد سبحانی (پ: ۱۹۴۴ء)، ہدایت پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۸ء
جہاد کیا ہے؟، مولانا یحییٰ نعمانی، کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند، ۲۰۱۱ء
فقہ الجہاد، علامہ یوسف القرضاوی (۲۰۲۲م)، مکتبۃ وھبۃ، القاھرۃ، ۲۰۰۹ء
کیا ہے غزوۂ ہند کی حقیقت؟، ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن، خسرو فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۲۴ء
ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ، خصوصی اشاعت ''جہاد-کلاسیکی وعصری تناظر میں'' مارچ ۲۰۱۲ء

متفرقات

ابن القریۃ والکتاب، ملامح وسیرۃ، علامہ یوسف القرضاوی، دار الشروق، قاہرہ، ۲۰۰۸ء
الشہاب لرجم الخاطف المرتاب، مشمولہ تالیفات عثمانی، شبیر احمد عثمانی، ادارہ اسلامیات، لاہور
العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام، سید قطب، دار الشروق، قاہرہ، ۱۴۱۵ھ
النبوات، شیخ ابن تیمیۃ الحرانی (ت۷۲۸ھـ)، أضواء السلف، الریاض، ۱۴۲۰ھـ/۲۰۰۰م
بوادر النوادر، مولانا اشرف علی تھانوی، شعبہ دار الاشاعت، دیوبند، ۱۳۶۵ھ
تاریخ بغداد، الخطیب البغدادی (۴۶۳ھ)، دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۵ء
زاد المعاد، ابن قیم الجوزیۃ (۷۵۱ھـ)، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۴م
کاروان ملت، مولانا وحید الدین خان، مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء
مولانا مودودی-شخصیت اور تحریک، ایک علمی جائزہ، ڈاکٹر فریدہ خانم، گڈ ورڈ بکس، نئی دہلی۔ ۱۳
المفردات في غریب القرآن، الراغب الأصفهانی (۵۰۲ھـ)، دار القلم، بیروت، ۱۴۱۲ھـ
میزان، جاوید احمد غامدی (پ: ۱۹۵۲ء)، المورد، لاہور، ۲۰۱۸ء
ھدایۃ الحیاری في أجوبۃ الیھود والنصاری، ابن قیم الجوزیۃ (۷۵۱ھ)، دار عطاءات العلم، الریاض، ۱۴۴۰ھـ-۲۰۱۹م
The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Stanford University Press, California, 2012
Universal Declaration of Human Rights, UNA

خسرو فاؤنڈیشن ۔ ایک نئی پہل

ہندوستان، جنت نشان جو مذہبی، لسانی اور تہذیبی تکثیریت کا ملک ہے اور کثرت میں وحدت سے جس کی پہچان ہوتی ہے اور اس عظیم ملک کی تاریخ کا ہر دور انسان دوستی کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے، جس میں شکتی اور شانتی بھکتوں کے گیتوں کا نتیجہ ہے اور ہندوستان ہمیشہ اس بات کا گواہ رہا ہے کہ دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے۔

پتہ نہیں کہ دنیا کو کس کی نظر لگ گئی کہ سماجی قربتیں، فاصلوں میں بدلنے لگیں ہیں۔ اس دیس کے باسیوں کی بڑی تعداد اگرچہ آج بھی اس عدم اتفاق اور تفریق کا حصہ بننے کو تیار نہیں لیکن غالب ترین اکثریت بھی اگر خاموش رہے تو وہ اس کے وجود کو عدم میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اب زیادہ تر لوگ اپنی ذات کے گرد طواف کر رہے ہیں۔ غم زمانہ کی جگہ دردِ تنہا سے دو چار ہیں اور وہ انسان جو کبھی ضمیرِ دشت و دریا تھا آج اسیرِ آشیانہ بنا ہوا ہے۔ ان حالات میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہا جا سکتا اور اس لئے ضروری ہے کہ ایک بار پھر ان تمام علامتوں کو زندہ کیا جائے جو ''محبتوں کی گاتھا'' اور ''پریم کے ڈھائی اکچھر'' سے لوگوں کو ایک دوسرے سے جوڑے رہے جن کے نزدیک مادرِ وطن، وہاں پیدا اور بسنے والے، اس کے دریاؤں کا پانی پینے والے، اس کے کھیتوں میں پیدا ہونے والے رزق سے اپنی بھوک مٹانے والوں کو پھر اس بات کا احساس دلایا جائے کہ ان کا مذہب، زبان اور علاقہ کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن ماں اور ماٹی سے ان کا رشتہ اس دنیا کے پیدا

کرنے والے اور چلانے والے رب کی مرضی کا نتیجہ ہے اور جس میں رب راضی اس میں سب راضی رہیں، تو ہی بہتری اور بھلائی ہے۔

ہندوستان میں ایک دوسرے کو جوڑنے والوں کا اگر ذکر کیا جائے تو ان کے نام اور کام گنانے میں کوئی دیر نہ لگے گی لیکن اگر ایک دوسرے کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والوں اور بانٹنے والوں کے نام کسی سے پوچھے جائیں تو اسے ان کے نام یاد کرنے اور بتانے میں بڑی مشکل آئے گی۔

اس سب کے باوجود آج پھر یہ دوریاں، یہ ٹکراؤ اور یہ تشدد بار بار کیوں دیکھنے کو مل رہا ہے؟ اس کا سیدھا سادھا جواب یہی ہے کہ ہم نے انہیں بھلا دیا ہے جنہیں ہمیں یاد رکھنا چاہیے۔ دیوی دیوتاؤں، پیغمبروں، پیروں اور رشیوں مُنیوں کے تیاگ، تپسّیا، سمرپن اور سیوا بھاؤ کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے سندیش اور اپدیش ایک دفعہ پھر لوگوں تک پہنچائے جائیں۔

یہی وہ سوچ اور فکرمندی ہے جس کے تحت ''خسرو فاؤنڈیشن'' کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ حضرت امیر خسرو ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی وہ محبوب، دلنواز اور ہمہ گیر شخصیت ہیں جنہیں صدیاں گزر جانے کے باوجود یاد رکھا گیا اور ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ وہ بیک وقت صوفی بھی تھے اور سپاہی بھی، وہ شاعر بھی تھے اور ماہرِ موسیقی بھی، وہ مؤرخ بھی تھے اور تاریخ ساز بھی۔ غرض ان کی شخصیت کی عبقریت نے ان کو گوں ناگوں صفات کا حامل اور ہمہ جہت پہلوؤں سے اس طرح متصف کیا کہ عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ میں بڑے بڑے نامیوں کے نشان مٹ گئے لیکن جب سے آج تک نہ صرف ہماری تاریخ کے جز بلکہ انسانی ذہنوں میں زندہ و تابندہ ہیں۔ مسرت کے لمحے ہوں یا یاس وغم کی گھڑیاں، خسرو کا نام اور کلام ہمہ وقت اپنی جاذبیت اور آفاقیت کے اعتبار سے ہمارے ساتھ ہے۔

اس گتھی کو تو ماہرینِ نفسیات ہی سلجھا سکتے ہیں کہ خسرو نے کس طرح حال و قال، جنگ و جدل، سوز وساز، خانقاہ اور دربار کے درمیان توازن برقرار رکھا۔ یہ اس لیے بھی اہم ہیں کہ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ انہوں نے یہ توازن اپنی شخصیت کے کھرے پن کے ساتھ قائم کیا تھا۔ ان کی ہر وابستگی اور ہر رول کھلی کتاب کی طرح سب پر عیاں تھا اور اس

کھلے پن کے تعلقات کے باوجود زندگی بھر کامیاب رہے۔صدق بہ تدبّر کی مثالیں امیر خسرو کی شخصیت کو ہمارے لئے اور بھی آئیڈیل بناتی ہیں۔

اس ''ترک نژاد'' کی وطن دوستی نہ صرف مثالی، بلکہ قابلِ رشک بھی ہے۔خسرو کے نزدیک یہ سرزمینِ ہند، عدن کی جنت، یہاں کے لوگ ہر رنگ میں انہیں عزیز، یہاں کے درباروں کے آگے ایران، توران، خراسان کے دربار ہیچ۔ یہاں کے لوگ ہر صنعت، علم وادب کی ہر شاخ، فنونِ لطیفہ کے ہر میدان اور عسکری تربیت کے ہر انداز میں ''بے نظیر'' اہلِ ہند کا توحیدی مسلک انہیں باوجود ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے عزیز ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ وہ (یعنی اہلِ ہند) ہمارے جیسا دین نہیں رکھتے، مگر ان کے اکثر عقیدے ہمارے جیسے ہیں۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ہندوستان، ہندوستان کی ہر روایت چاہے وہ مذہبی ہو چاہے تہذیبی، ثقافتی ہو یا لسانی، علمی ہو یا ادبی، اس کو خسرو کی طرح دیکھیں، اپنائیں، اس پر صدقے اور واری جائیں۔خسرو جن کی ماں ہندی اور باپ ترک تھے، ایسے ہندوستانی ہیں جو ہندوستان کی عظمت کے ترانے ہی نہیں گاتے بلکہ وہ اپنے آپ کو اس مٹی کا اس طرح حصہ بن جانا چاہتے ہیں جیسے یہ مٹی ہی سب کچھ ہو اور جس سے تعلق اور محبت کو الطاف حسین حالیؔ نے یوں بیان کیا ہے:

تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

خسرو فاؤنڈیشن وطن دوستی، انسان دوستی، فطرت سے ہم آہنگی، ہر طرح کی تفریق چاہے وہ فرقہ وارانہ ہو یا جنسی سب سے اوپر اٹھ کر محبت کو عام کرنا چاہتی ہے۔اس لئے کہ بقول شیخ ابراہیم ذوقؔ:

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

❁❁❁

مولانا ڈاکٹر ذیشان احمد مصباحی ایک معتدل فکر کے حامل روشن خیال اسلامی اسکالر اور مصنف ہیں۔ ڈاکٹر مصباحی نے اہل سنت کی معروف دینی درس گاہ جامعہ اشرفیہ مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ سے فضیلت کی سند حاصل کی ہے، جب کہ معروف قومی دانش گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے تقابل ادیان میں ایم اے اور پھر اسلامک اسٹڈیز سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی تکمیل کی۔

ڈاکٹر مصباحی کو زمانۂ طالب علمی سے ہی تحقیق و تصنیف کا ذوق رہا ہے۔ موصوف نے مختلف موضوعات پر سیکڑوں تحقیقی مقالات و مضامین و تبصرے اور تجزیے لکھے ہیں، جو ملک و بیرون ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں چھپتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ درجن بھر سے زائد قومی و بین الاقوامی سمیناروں میں اپنے مقالات پیش کر چکے ہیں۔ روایتی فکر سے الگ ہٹ کر عصری تقاضوں کے مطابق موضوعات کا انتخاب کرنا اور ان پر قلم اٹھانا ڈاکٹر مصباحی کی سرشت میں شامل ہے، جس کی وجہ سے وہ نئے موضوعات پر غیر جانب دارانہ تحقیق و تنقید کے حوالے سے اپنی منفرد شناخت کے حامل ہیں۔

مولانا مصباحی دینی، سماجی اور عرفانی موضوعات پر متعدد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ ان کی کچھ اہم تصانیف میں ● جدید ذرائع ابلاغ سے رویت ہلال کا ثبوت، ۲۰۱۸ء ● مسئلۂ تکفیر و متکلمین، ۲۰۲۰ء ● الموسیقی فی الاسلام، ۲۰۰۳ء ● طلاق ثلاثہ۔ علمی تحقیق و عصری تعبیر (غیر مطبوعہ) ● شیخ سعد خیر آبادی اور فقہ و تصوف کے فروغ میں ان کی خدمات (پی ایچ ڈی کا مقالہ، غیر مطبوعہ) شامل ہیں۔ زیر نظر تصنیف ''تفہیم جہاد'' بھی ان کے اسی اعلیٰ معیار تحقیق اور معتدل طرز فکر کا شاہ کار ہے۔

مصباحی صاحب اس وقت خانقاہ عارفیہ، سید سراواں میں مقیم اور وہاں جامعہ عارفیہ اور شاہ صفی اکیڈمی کے مختلف شعبوں سے وابستہ ہیں۔ موصوف ایک زمانے تک ماہ نامہ ''جام نور'' دہلی کی ادارت میں بھی شامل رہے ہیں اور فی الحال اپنے چند احباب کے ساتھ مل کر تصوف پر ایک علمی، تحقیقی اور دعوتی مجلہ ''الاحسان'' کی ادارت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

Mob : +91-9910644086 Email : zishanmisbahi@gmail.com